۸

سلسلہ انجمن ترقّیِ اُردو نمبر ۱۲۱

حکایاتِ رُومی

پہلا حصّہ

ترجمہ از

مرزا نظام شاہ صاحب لبیب

بہ نظر ثانی

مولوی سیّد ہاشمی صاحب فرید آبادی

شایع کردہ

انجمنِ ترقّیِ اُردو (ہند) دہلی

۱۹۳۹ء

خانصاحب عبداللطیف نے لطیفی پریس دہلی میں چھاپا

اور

مینجر انجمنِ ترقی اُردو (ہند) نے دہلی سے شایع کیا

دیباچہ

مولانا رومی قدس سرہ العزیز کی مثنوی شریف میں صدہا حکایات، محاضرات و مطائبات شامل ہیں اور دوسرے محاسن و کمالات کے علاوہ اس بزرگ کتاب کا ایک امتیازی وصف یہ ہو کہ تمثیل کے پیرائے میں اخلاق و نفسیات کے باریک مسائل اور تصوّف و روحانیات کے صدہا رموز و اسرار کو اس طرح بیان کیا ہو کہ نہ صرف دماغ بلکہ دل میں اُتر جاتے ہیں۔ مجھے ایک مدّت سے خیال تھا کہ ممکن ہو تو ان قصص و حکایات کو یکجا اردو میں ترجمہ کردیا جائے تاکہ ہمارے ملک کے عام ناظرین اور طلبہ بھی حضرت مولانا کے دریائے فیوض و برکات سے بقدر توفیق بہرہ مند ہوسکیں۔ اپنی کم فرصتی کے باعث بعض اہل قلم احباب سے بھی تحریک کی۔ زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا کہ جناب قاضی تلمّذ حسین صاحب ایم۔ اے نے مثنوی شریف کو نئی ترتیب کے ساتھ "مراۃ المثنوی" کے نام سے شائع کیا اور حکایات کے موتی جو اصل کتاب میں دُور دُور ٹکے ہوئے ہیں، انھیں ایک جگہ لڑیوں میں پرو دیا۔ اس سے مکرمی مرزا نظام شاہ صاحب **لبیب** (گورگانی) کو تجویز کے مطابق، ترجمہ کرنے میں بڑی سہولت ہوگئی۔ صاحب عالم اُردو زبان کے کہنہ مشق ادیب اور شاعر اور اسی کے ساتھ دنیائے تصوّف کے دانا و بینا سیّاح ہیں۔ انھوں نے ان حکایات کا ترجمہ بڑے ذوق شوق سے 'قلعۂ معلّٰی' کی ٹکسالی زبان میں کیا۔ کہیں کہیں اپنے مستقر ثانی، حیدرآباد کے محاوروں میں چاشنی دے کر اسے اور مزیدار بنا دیا۔ لیکن،

متن کے لفظ و معنیٰ کی پابندی سے ترجمہ کہانیوں میں بھی اسلامی تصوّف کا اتنا گہرا رنگ آگیا کہ عام اردو ناظرین کے واسطے کتاب دشوار اور پیچیدہ نظر آنے لگی اور اس خیال سے کہ اصل مقصد ہاتھ سے جانے نہ پائے، بجز اس کے چارہ نہ رہا کہ اردو ترجمے کی غور و احتیاط سے نظر ثانی کی جائے اور وہ حکایتیں یا تمثیلات جو خالص مذہبی رنگ کی یا محض مسلمانوں کی اعتقادی ہیں، حذف کردی جائیں (۲) بعض قصے جو اپنی جگہ پر مناسب ہیں لیکن علیحدہ منتخب کیے جانے میں ان کی عُریانی بچّوں یا عورتوں کے سامنے لانے کے لایق نہیں رہی ان کو چھوڑ دیا جائے۔ (۳) جہاں استدلال زیادہ دقیق یا دلائل طولانی اور مکرر آگئے ہیں، وہاں اختصار و سادگی سے کام لیا جائے۔ غرض یہ کہ کتاب صرف کہانیوں کا مجموعہ اور ہر پڑھنے والے کی دلچسپی کا باعث رہے۔ ہاں اس کے ضمن میں اخلاقی نصائح اور حضرتِ مصنّف رحمۃ اللہ علیہ کی بزرگانہ تعلیم کا پیرایہ ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ فقط

سیّد ہاشمی (فریدآبادی)

دہلی۔ شعبان ۱۳۵۸ھ

فہرست مضامین حکایاتِ رومیؒ

حصۂ اوّل

دفتر اول مثنوی شریف

صفحہ

دفتر دوم مثنوی شریف

دفترِ سوم مثنوی شریف

(ختم حصہ اوّل حکایاتِ رومی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بادشاہ اور کنیز

دوستو! ایک قصہ سنو، جو ہمارے حال پر صادق آتا ہے۔ اگر اپنے حال کو ہم پرکھتے رہیں تو دنیا اور آخرت دونوں جگہ پھل پائیں:۔

اگلے زمانے میں ایک بادشاہ تھا جسے دُنیا و دین دونوں کی بادشاہی حاصل تھی۔ ایک دن شکار کے لیے مصاحبوں کے ساتھ سوار ہو کر نکلا۔ گھوڑا دوڑاتا پھرتا تھا کہ یکایک عشق کا شکار ہو گیا۔

سرِ راہ ایک لونڈی نظر پڑی کہ دیکھتے ہی دل و جان سے اس کا غلام ہو گیا، منہ بولی قیمت دے کر لونڈی کو مالک سے خریدا اور بادشاہ بیگم بنالیا۔ اتفاق دیکھیے کہ وہ بیمار ہوئی۔ بادشاہ نے اپنے مُلک اور بیرونِ سلطنت کے حاذق حکیموں کو علاج کے لیے جمع کیا اور ان سے فرمایا کہ میری جان بھی اسی کی زندگی پر منحصر ہے بلکہ یقین جانو کہ خود میں بیمار ہوں اور جب تک وہ اچھی نہ ہو جائے میں تندرست نہیں ہو سکتا۔ جو طبیب مرض شناس میری جان کو آسایش پہنچائے گا وہ بے اندازہ دولت سے مالا مال کر دیا جائے گا۔

ارزاں کرنے والا

طبیبوں نے عرض کیا کہ اے بادشاہ ہم میں سے ہر ایک مسیحِ زمانہ ہے، بھلا وہ کون سی بیماری ہے جس کی دوا ہمارے پاس نہیں، ہم اپنی جان لڑا دیں گے اور تشخیصِ مرض و علاج میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھیں گے۔

اُنھوں نے شیخی میں یہ بھی نہیں کہا تھا کہ خدا چاہے گا تو علاج کامیاب ہوگا۔ خدا نے اپنی قدرت کے آگے انسانی تدبیر کی کمزوری اس طرح ظاہر کی کہ انھوں نے علاج میں جس قدر زیادہ سرگرمی دکھائی اسی قدر بیماری اور بڑھتی گئی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ کنیز سوکھ کے کانٹا ہوگئی اور اُدھر یہ حال کہ روتے روتے بادشاہ کی آنکھوں سے خون کے دریا بہ نکلے۔

خدا کی قدرت! سکنجبین سے صفرا اور روغنِ بادام سے خشکی پیدا ہوتی تھی۔ ہڑ سے قبض ہونے لگا۔ غرض دواؤں کی تاثیر اتنی بدلی کہ جو چیز مریضہ کی صحت اور آرام کے لیے دی جاتی تھی اس سے تکلیف سوا ہوجاتی تھی۔ رفتہ رفتہ بیمار کا دل ضعیف ہوگیا، نیند بالکل اُچٹ گئی، آنکھوں میں جلن اور دل میں دھڑکن رہنے لگی نتیجہ یہ کہ سارے شربت، دوائیں اور تیمارداری کے سامان بے کار ثابت ہوئے اور طبیب بھی شرمندہ ہوئے اور طبیبوں کی ساری شیخی کرکری ہوگئی۔

جب بادشاہ نے اچھی طرح دیکھ لیا کہ طبیبوں کے بنائے کچھ نہیں بنی تو ایک رات ننگے پانو مسجد میں پہنچا اور سجدے میں گر کر اس قدر پھوٹ پھوٹ کر رویا کہ سجدے کی جگہ آنسوؤں سے تر ہوگئی۔ جب ذرا دل ٹھیرا تو دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے اور عرض کیا کہ بارِ الٰہا! سارے جہان کی بادشاہت بخش دینا تیری ادنیٰ بخشش ہے اس کے مقابلے میں یہ بندہ جو آرزو لے کر حاضر ہوا ہے وہ کیا حقیقت رکھتی ہے۔ ہماری ساری دوا دوش اور ان طبیبوں کی تدبیریں تیری رحمت کے اشارے کے آگے گرد ہیں۔ اے سارے

عالم کے حاجت روا! ہم نے بہت ہی غلط راستہ اختیار کیا کہ تجھ سے مدد نہ چاہی اور اپنی کم زور تدبیروں پر اڑے رہے۔ اے سارے جہان کی فریاد سننے والے! تو نے خود ہی فرمادیا ہے کہ میں ہر بندے کے دل کی بے تابی سے واقف ہوں مگر بخشش اور عطا اُسی پر کی جاتی ہے جو علانیہ بھکاری بن کر ہماری بارگاہ میں ہاتھ پھیلائے!

بادشاہ نے ایسی تڑپ کر دعا کی تھی کہ دریائے رحمت میں جوش آگیا۔ بادشاہ کو نیند کی سی غنودگی طاری ہوئی۔ خواب میں کیا دیکھتا ہے کہ ایک مردِ بزرگ تشریف لائے ہیں، فرماتے ہیں کہ اے بادشاہ! مُبارک ہو تیری دُعا قبول ہوئی۔ کل ہمارا بھیجا ہوا ایک مسافر آئے گا، وہ بڑا دانا حکیم ہے اور اس کی حذاقت میں ذرا شک نہیں اس لیے تجھ پر لازم ہے کہ اس کی ہر ہدایت کی تعمیل کرے اس کے علاج کی کرامت تجھے خود معلوم ہو جائے گی۔

بادشاہ یہ خواب دیکھتے ہی چونک اُٹھا غفلت کے پردے اُٹھ گئے۔ کنیز کی محبت نے غلام بنا رکھا تھا اب گویا ازسرِنو آزادی اور بادشاہی پائی۔ جب دن نکلا اور آفتاب مشرق سے برآمد ہوا تو بادشاہ بالاخانے کے برآمدے میں آبیٹھا۔ راستے پر نگاہ لگی ہوئی تھی کہ دیکھیے پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہے کہ ایک مردِ بزرگ صاحب کمال سائے میں دھوپ کی طرح چلے آتے ہیں۔ جب قریب پہنچے تو دیکھا کہ سر سے پیر تک نور جھمک رہا ہے۔ بادشاہ خود پیشوائی کو آگے بڑھا۔ اس غیبی مہمان سے بادشاہ اس طرح ملا جس طرح کہ شکر گلاب کی پتیوں میں پیوست ہو جاتی ہے۔ یوں سمجھو کہ جیسے دو جانیں باہم بخیہ ہو کر ایک ہو رہی تھیں۔ ان کی ایسی مثال تھی جیسے ایک پیاسا اور دوسرا پانی یا ایک مے پرست اور دوسرا شراب۔ الغرض لے

دیکھ کر بادشاہ نے (اپنے جی میں کہا) کہا کہ اے مردِ خدا میرا معشوق تو دراصل تو تھا لیکن جہان میں ایک کام دوسرے کام کے ذریعے سے پیدا ہوا کرتا ہے سو اس عشق کا ذریعہ کنیز کا عشق ہوا۔ اے فرستادۂ خدا! تو میرے حق میں مصطفیٰ کا درجہ رکھتا ہے۔ اب میں عمرؓ کی طرح تیری خدمت و اطاعت پر کمر بستہ ہوں گا۔

الغرض بادشاہ باوجود شوکت وحشمت کے بالکل فقیرانہ خاکساری کے ساتھ اپنے مہمان کے سامنے گیا۔ کبھی ہاتھوں کو چومتا، کبھی پیشانی کو بوسہ دیتا، کبھی وطن اور سفر کا راستہ دریافت کرتا، یوں ہی پوچھتا پوچھتا اپنے ایوانِ شاہی میں لے گیا اور جی میں خوش ہو کر کہنے لگا کہ میں نے یہ بے قیاس دولت تو پائی مگر بڑے صبر کے بعد۔ صبر تلخ تو ہوتا ہے لیکن اس کا پھل میٹھا اور نتیجہ کامیاب دیکھا۔

مہمان کو کھانا کھلایا اور ماندگیِ سفر دور ہونے کے بعد حرم سرائے شاہی میں لے جا کر بیمار کو دکھایا اور احوال مرض بیان کیے۔ وہ خدا کے ولی بیمار کے پاس بیٹھ گئے، چہرے کا رنگ، نبض، قارورہ وغیرہ دیکھ کر مرض کی علامتیں اور تمام ابتدائی اسباب دریافت کر کے کہا کہ جو دوا ان طبیبوں نے کی وہ سب بالکل غلط تھی۔ ولی اللہ نے ظاہری صورت سے پوشیدہ مرض تاڑ لیا لیکن بادشاہ کو اس کی خبر نہ دی۔ دراصل اس کی بیماری صفرا یا سودا کی زیادتی سے نہ تھی۔ ہر لکڑی اپنے دھوئیں سے پہچانی جاتی ہے، جب ولی اللہ نے پہچان لیا کہ اسے دل کی بیماری ہے اور باقی بالکل تندرست ہے تو بادشاہ سے مخاطب ہوا اور کہا کہ اے بادشاہ مجھے مریضہ سے کچھ پوچھنا ہے، چاہتا ہوں کہ

سب اپنے بیگانے یہاں سے الگ کر دیے جائیں۔ بادشاہ نے محل میں تنہائی کرا دی اور خود بھی باہر چلا گیا تاکہ ولی اللہ اپنے حسبِ منشا حال دریافت کر سکیں۔

جب سارا محل خالی ہو گیا اور سوائے طبیب و مریض کے کوئی نہ رہا تو اُن بزرگ نے آہستہ آہستہ سوالات شروع کیے کہ تمھارا شہر کون سا ہے کیوں کہ ہر شہر کا طریقِ علاج الگ ہوتا ہے اور تمھارے قرابت دار کون کون سے ہیں، ان میں زیادہ نزدیک کے عزیز کون ہیں اور ان میں سب سے زیادہ محبت کن سے ہے۔ نبض پر ہاتھ رکھ کر زمانے کے تلخ و تُرش کی داستانیں سُننے لگے۔ مریضہ بھی حکیم کو کامل پا کر ہر راز کو فاش کرنے لگی، جہاں جہاں وہ فروخت ہوئی اور جن جن شہروں میں رہی سب حال صاف صاف بیان کیا۔ وہ بزرگ سلسلہ وار اس کی داستان سُن رہے تھے لیکن پوری توجہ اس کی نبض پر تھی کہ دیکھیں کس کے ذکر پر نبض غیر معمولی حرکت کرتی ہے۔ القصّہ کنیز نے اپنے شہر کے تمام دوستوں، عزیزوں کو گنایا اس کے بعد دوسرے شہر کا تذکرہ کیا مگر چہرے کے رنگ اور نبض کی حرکت میں کوئی فرق نہ آیا۔ یہ پوچھ گچھ یوں ہی آگے بڑھتی گئی۔ ایک ایک شہر اور ایک ایک مکان کے واقعے اور حادثے اس نے سنائے مگر نہ چہرے کے رنگ میں کوئی فرق آیا نہ نبض میں کوئی حرکت خلافِ معمول پیدا ہوئی یہاں تک کہ رفتہ رفتہ شہر سمرقند کا ذکر زبان پر آیا۔ اس ذکر کے ساتھ ہی اس نے ایک ٹھنڈا سانس لیا اور آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی اور بیان کیا کہ ایک سوداگر مجھے اس شہر میں لایا اور ایک مالک کے ہاتھ جو سُنار تھا مجھے فروخت کر دیا، اس نے مجھے چھ مہینے تک اپنے پاس

رکھا اور اس کے بعد بیچ ڈالا جب اِس واقعے کو بیان کر رہی تھی تو غم کی آگ دفعتہً بھڑک اُٹھی، اس کی نبض حرکت میں آئی اور چہرا زرد پڑ گیا۔ جب ان بزرگ کو اس بھید سے آگاہی ہوئی تو مریضہ کی بیماری کے طول کھینچنے کا سبب معلوم ہو گیا۔ انھوں نے پوچھا کہ وہ زرگر کس محلّے اور کس بازار میں رہتا ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ محلہ غاتفر میں پُل کے پاس رہتا ہے۔ جب سارے اتے پتے پوچھ لیے تو ان بزرگ نے بہت کچھ دلاسا دیا کہ اب یقین کر کہ تیری بیماری گئی۔ چونکہ مجھے تیری بیماری کی اصلیت معلوم ہو گئی ہے، انشاء اللہ تیرے علاج میں جادو کی کیفیت ظاہر ہو گی۔ مگر ایک پابندی ضروری ہے وہ یہ کہ یہ بھید تو کسی سے بیان نہ کرے چاہے بادشاہ تجھ سے کتنا ہی کرید کرید کر پوچھے تو اس پر بھی ظاہر نہ کیجیو۔

پھر وہ بزرگ مریضہ کے پاس سے اُٹھ کر بادشاہ کے پاس آئے اور اپنی مصلحت کے مطابق مریضہ کا کچھ حال سُنا کر مطمئن کر دیا۔ بادشاہ نے پوچھا کہ حضرت اب تدبیر کیا ہے اور علاج شروع کرنے میں کیا دیر ہے۔ بزرگ نے کہا کہ اس کی بیماری کا علاج تو بس یہی ہے کہ سمرقند سے ایک سنار طلب کیا جائے اس کو انعام و اکرام کا امیدوار بنایا جائے اور اس کے لیے اشرفیاں اور خلعت روانہ کیا جائے تاکہ وہ اس لالچ میں آکر تیرے پاس حاضر ہو اور تیرا محبوب اس کی ملاقات سے ایسا خوش ہو کہ یہ غم اور بیماری جاتی رہے۔ جب سُنار تیری اتنی داد و دہش دیکھے گا تو وہ اپنے گھر بار سے جُدا ہو کر یہیں آ پڑے گا۔

بادشاہ نے اس ہدایت کو دل و جان سے قبول کیا اور عرض کیا کہ جو حکم آپ دیں گے میں اسی کی تعمیل کروں گا۔ پھر دو امیر روانہ کیے جو بڑے ذی شعور، امانت دار اور سچے تھے۔ وہ دونوں کے دونوں سمرقند پہنچے اور زرگر کو بادشاہ

کے بُلاوے کی یہ خوش خبری دی کہ ای اُستاد تیرا چرچا تمام دنیا میں ہو رہا ہی، ہمارے بادشاہ نے زیورات کی تیاری کے لیے تجھے امیر بنا دینے کا ارادہ کیا ہی چنانچہ یہ خلعت اور دینار و درم تیرے لیے بھیجے ہیں اور جب دار السلطنت میں حاضر ہو گا تو بادشاہ کا مصاحبِ خاص تو ہی رہے گا۔ زرگر نے جب اتنا کثیر مال اور بیش بہا خلعت دیکھا تو پھولا نہ سمایا، اپنے وطن اور بال بچّوں کو چھوڑ دینے کی ٹھان لی۔ خوشی خوشی طی مسافت کرنے لگا اور اس بات سے بے خبر تھا کہ بادشاہ نے اس کی جان لینے کا قصد کیا ہی۔ ایک عربی گھوڑے پر سوار ہو کر بہت تیزی سے دوڑاتا ہُوا چلا اور اپنے خوں بہا کو خلعت سمجھا جب وہ مردِ مسافر دار السلطنت میں پہنچا تو طبیب نے اس کو حضور شاہ میں بڑی خوشی اور اظہارِ کامیابی کے ساتھ پیش کیا کہ وہ شمع حسن پر جلایا جائے۔

بادشاہ نے زرگر کی بہت خاطر کی اور سونے کا ایک ڈھیر اس کے سپرد کر کے حکم دیا کہ ہنسلی، جھانجن، کمر پٹہ، گھوڑوں کی زینت کے زیور اور وہ تمام برتن اور آرایشی ظروف جو بادشاہوں کی بزم کے لائق ہوں تیار کیے جائیں۔ زرگر نے وہ سب سونا لیا اور بالکل بے خبر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ ان ولی اللہ نے سلطان سے عرض کی ای بادشاہِ ذی جاہ اس کنیزک کو زرگر کے حوالے کر تا کہ وہ اس کی ملاقات سے آرام پائے۔ بادشاہ نے حسینہ کو زرگر کے حوالے کر دیا۔ یہاں تک کہ دونوں کی خوب خلا ملا ہو گئی۔ چھ مہینے تک دونوں یک جان و دو قالب رہے۔ جب کنیز کا دل بھر گیا تو حکیم نے زرگر کے واسطے ایک ایسا شربت تیار کیا کہ وہ پی کر روز بروز کم زور ہونے لگا۔ بیماری کی وجہ سے اس کا حسن و جمال پھیکا پڑنے لگا تو رفتہ رفتہ کنیز کا دل بھی اُچٹنے لگا اور جب بالکل بد شکل، بد مزاج اور ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تو بالکل ہی سرد ہو گیا۔

جوں جوں مردِ زرگر پر بیماری کا غلبہ ہوتا تھا وہ سونے کی طرح گھلا جاتا تھا اور کہتا تھا کہ میں وہ مشکی ہرن ہوں کہ صیاد نے جس کی نافت سے سارا خون نکال ڈالا ہو مگر جس نے اپنی غرض کے لیے مجھے موت کے گھاٹ اُتارا ہے وہ یہ نہیں جانتا کہ میرا خون یوں ہی سوتا کا سوتا نہیں رہے گا۔ جو بلا آج مجھ پہ ہے کل اس پر بھی آئے گی، بھلا مجھ جیسے حسین وخوش رُو جوان کا خون ضائع ہو سکتا ہے۔ یہ آخری فقرے تھے جو کہتے کہتے ٹھنڈا ہوا اور کنیز درد و رنج کی آفت سے چھوٹی کیونکہ قاعدہ ہی یہ ہے کہ مرنے والوں کے ساتھ عشق دیر پا نہیں ہوتا کیوں کہ وہ پھر پلٹ کر آنے والے نہیں مگر زندہ کا عشق نہ صرف جان میں بلکہ آنکھوں میں بھی پھول کی کلی کی طرح ہر دم تازہ رہتا ہے۔ لہٰذا تجھ کو اس زندہ سے عشق کرنا چاہیے جو ہمیشہ باقی رہنے والا ہے اور ایسا باقی ہے جو ہر آن تجھ کو شرابِ حیات پلاتا رہتا ہے۔ عشق اس کا اختیار کر جس کے عشق سے تمام انبیا نے فروغ پایا اور یہ کہنا تو کوئی بات نہیں کہ اس بارگاہ تک ہماری رسائی ممکن نہیں۔ اجی! بڑے سے بڑے کام بھی دریادلوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہیں۔

ولی اللہ کی تدبیر سے مردِ زرگر کا مارا جانا نہ تو کسی خطاب کی توقع سے ہوا اور نہ کسی عتاب کے خوف سے۔ بات یہ ہے کہ جب تک خدا کی طرف سے اشارہ نہ ہوا انھوں نے صرف بادشاہ کی خوشنودی کی خاطر یہ کام نہیں کیا اور بادشاہ نے بھی ایک بندۂ خدا کا خون محض نفسانیت کے لیے نہیں کیا۔

وہ حکیم اغراضِ نفسانی سے بالکل پاک تھا اور جو کچھ اس نے کیا وہ نیکی پر مبنی تھا لیکن وہ نیکی بدی کے پردے میں پوشیدہ تھی۔ اگر کسی مسلمان کا خون بہانا اس کا مقصد ہو اور باوجود اس کے میں اس کی تعریف کروں تو میں کافر!

ادھر وہ بادشاہ بھی معمولی بادشاہ نہ تھا بلکہ باخدا اللہ کا خاص بندہ۔ تم اپنے

احوال و افعال کے لحاظ سے خدا کے پاک بندوں کے احوال و افعال پر قیاس کرتے ہو مگر دراصل صحیح نتیجے سے تم بہت دور جا پڑے ہو لہٰذا تم طریق انکار و اعتراض میں جلدی نہ کرو ۔ دیکھو میں تمھیں ایک اور قصّہ سناتا ہوں شاید تمھارا نصیب یاوری کرے اور تم کوئی اچھی نصیحت حاصل کر لو ۔



ایک طوطے کا گنجے فقیر کو اپنی طرح سمجھنا

ایک پنساری کے پاس طرح طرح کی بولیاں بولنے والا ، خوش رنگ طوطا تھا ۔ وہ طوطا دکان کی نگہبانی کرتا اور آنے جانے والوں سے مزے مزے کی بولیاں بولتا تھا ۔ ایک دن اتفاق یہ ہوا کہ مالک اپنے گھر گیا ہوا تھا اور دکان پر طوطا نگہبانی کر رہا تھا کہ اتنے میں ایک بلّی چوہے پر دوڑی ، طوطا اپنی جان بچانے کو جونہی ایک طرف بھاگا تو گڑبڑ میں روغنِ بادام کی بوتلیں لڑھک گئیں ۔ جب مالک گھر سے واپس آیا تو دیکھا کہ تیل کے چکتوں سے تمام فرش چکنا ہوگیا ہے ۔ بنیے نے خفا ہو کر طوطے کے سر پر ایک ایسا دھپ لگایا کہ چوٹ کے صدمے سے وہ گنجا ہوگیا ۔ کئی دن تک طوطے نے بولنا چالنا ترک کر دیا اور پنساری اپنی حرکت پر پشیمان ہونے لگا ۔ وہ اپنی ڈاڑھی نوچتا اور اپنے جی میں آپ کہتا کہ افسوس ! کاش کہ میرا ہاتھ اس بُری گھڑی سے پہلے ہی ٹوٹ جاتا جس گھڑی میں نے اس کے سر پر دھپ لگایا تھا ۔ اسی پشیمانی میں وہ ہر صاحبِ دل درویش کے آگے نذرانے پیش کرتا تھا کہ کسی طرح اس کا طوطا پھر بولنے لگے ۔ اسی طرح کئی دن گزر گئے ۔ پنساری حیران و پریشان اپنی دوکان پر بیٹھا تھا اور دل میں غم و غصہ کھا رہا تھا کہ دیکھیے میرا طوطا کبھی بولے گا بھی یا نہیں کہ اتنے میں ایک ملنگ فقیر

چار ابرو کا صفایا کیے اور اوندھے ہوئے پیالے کی طرح سر گھٹائے اس طرف سے گزرا ۔ طوطے نے فوراً درویش پر آوازہ کسا اور کہا کہ اب اوگنجے! شاید تو نے بھی تیل کی بوتل گرائی ہے جو تجھے گنجا ہونا پڑا؟ سننے والے بے اختیار ہنس دیے کہ لو صاحب یہ طوطا فقیر کو بھی اپنی مانند سمجھتا ہے۔ لہٰذا تم اپنے احوال پر خدا کے پاک بندوں کا اندازہ نہ کرو۔ اگرچہ لکھنے میں شیر (درندہ جانور) اور شِیر کی شکل ایک ہے لیکن معنی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اکثر ایسا ہوا کہ لوگوں نے خدا کے نیک اور برگزیدہ بندوں کو نہیں پہچانا اور گمراہ ہو گئے۔



ایک یہودی وزیر کا مکر و فریب سے نصرانیوں میں تفرقہ ڈلوانا

ایک یہودی بادشاہ بہت ظالم تھا وہ عیسیٰؑ کا دشمن اور عیسائیوں کا قاتل تھا اگرچہ وہ زمانہ عیسیٰؑ کی تصدیق کا تھا مگر وہ موسیٰؑ کے نام پر دیوانہ تھا۔ اس ناسمجھ بادشاہ نے خدا کی راہ میں بھی خدا کے دو پیاروں کو ایک دوسرے سے جُدا کر دیا تھا ۔ وہ اپنی یہودیت کے تعصب میں بھینگا سوچنے لگا تھا۔ اس نے لاکھوں عیسائیوں کو چن چن کر اس قدر ظلم سے مارا کہ موسیٰؑ کا دین بھی تھر تھر کانپنے لگا۔

مارے ڈر کے عیسائیوں نے طے کیا کہ اپنی اپنی جان بچائیں اور اپنے دین و مذہب کو فرشتے سے بھی چھپائیں ۔ اس بادشاہ کا ایک وزیر رہزنِ دین و ایمان تھا۔ اپنے مکر سے پانی پر گرہ لگاتا تھا۔ اس نے عرض کی کہ ای بادشاہ! تو جوان چھپے عیسائیوں کی تلاش میں مصروف ہو گیا ہے تو اس میں کامیابی نہ ہو گی کیوں کہ دین کوئی مشک و عود کی خوش بو تو ہے نہیں کہ الگ پہچانی جا سکے اس لیے یہ اصول پوری قوم کو تباہ کرنے کے لیے کچھ مفید نہیں ۔ اس قوم کا دین سو غلافوں میں چھپ گیا ہے۔ اب ظاہر

میں یہ قوم تیری دوستی و ہم مشربی کا دم بھرتی ہے مگر باطن میں بالکل مخالف ہے۔ بادشاہ نے پوچھا کہ پھر تم ہی بتاؤ کیا تدبیر کی جائے کہ دنیا بھر میں نصرانی کا نام ونشان اور خفیہ طور پر بھی دینِ عیسوی کہیں باقی نہ رہے ۔اس نے کہا کہ اے بادشاہ! میرے کان اور دونوں ہاتھ کٹوا دے اور ناک اور ہونٹوں کو چروا کے مجھے سولی پر لٹکانے کی سزا تجویز کر۔ جب مجھے سولی کے نیچے لایا جائے تو ایک شخص کو مقرر کر کہ وہ تیرے حضور حاضر ہوکر رحم کی التجا کرے ۔ یہ سب کام ایسی عام جگہ ہونا چاہیے جہاں چوراہا ہو تاکہ خبر ہر طرف بہت جلد پھیل جائے ۔جب تو مجھے جان کی امان دے دے تو دیس نکالا کر کے شہر سے دُور کسی جنگل میں پھکوا دے تاکہ پھر میں ان نصرانیوں میں فساد ڈلوا دوں ۔ وہ اس طرح کہ میں پکار پکار کر کہوں گا کہ " اے دلوں کا بھید جاننے والے خدا تو واقف ہے کہ میں عیسائی زادہ ہوں ظالم بادشاہ کو خبر ہوگئی اور وہ ازراہِ تعصب میری جان کے پیچھے پڑ گیا ۔میں نے ہر چند چاہا کہ اپنا دین پوشیدہ رکھوں اور اپنے کو یہودی ظاہر کروں لیکن بادشاہ میرے بھید کی خوشبو پا گیا ۔اگر عیسیٰ مسیحؑ کی روح میری پشت و پناہ نہ ہوتی تو وہ یہودیت کے نشے میں میرے پُرزے پُرزے کر دیتا ۔ عیسےؑ کے واسطے میری جان ہلاک ہو یا سر اُڑ جائے تو کچھ پروا نہیں بلکہ ہزار ہا احسان مانوں کہ میری محنت ٹھکانے لگی ۔لیکن چونکہ میں دینِ عیسوی اور علمِ اناجیل میں کامل ہوں اس لیے یہ اندیشہ ضرور ہے کہ کہیں یہ دینِ پاک جاہلوں کے ہاتھ پڑ کر غارت نہ ہو جائے ۔خدا کا شکر ہے کہ اُس نے ہمیں اس دینِ برحق کا رہ نما بنایا اور اس کی ذات سے امید ہے کہ وہ نصرانی قوم کو ہماری رہ نمائی میں ہدایت عطا فرمائے گا "

پھر جب نصرانی قوم دین میں میری ہدایتوں پر عمل کرنے لگے گی تو میں ان کے درمیان ایسے ایسے فتنے اور فساد پھیلاؤں گا کہ میری چالاکی پر شیطان بھی

حیران رہ جائے گا۔ ایسے ایسے حیلوں سے اُن کو فریب دوں گا اور اس قدر افراتفری ڈالوں گا کہ آخرکار وہ آپس ہی میں خوں ریزیاں کرکے سب کے سب ختم ہو جائیں گے۔

جب وزیر نے مکاری کی تدبیریں الف سے یا تک سنادیں تو بادشاہ خاطر جمع ہو گیا۔ اس کو بھرے مجمع میں بے عزت کیا تاکہ تمام رعایا اس کے حال سے واقف ہو جائے اور پھر نصرانیوں کی آبادی کی طرف پھنکوا دیا کہ ان کو دعوت دے کر مکر کے جال میں پھنسائے۔

عیسائیوں نے اس کو ان بُرے حالوں دیکھا تو اس کے درد و مصیبت پر زار زار رونے لگے اور اس طرح رفتہ رفتہ ہزارہا عیسائی اس کے پاس جمع ہو گئے۔ وہ ان پر انجیل اور عقاید و عبادات کے باطنی حقایق کھولنے لگا اور حضرت مسیحؑ کے اقوال و افعال کا وعظ کرنے لگا۔ وہ بظاہر تو احکام مسیحی کا وعظ کرتا تھا مگر باطن میں یہ وہ سیٹی تھی جو جال کے پیچھے چھپ کے پرندوں کو بلانے اور پکڑنے کے لیے بجائی جاتی ہے۔ الغرض عوام النّاس کی تقلید تو اندھی ہوتی ہی ہے، سب عیسائی قوم اس پر فریفتہ ہو گئی، دلوں میں اس کی محبت جڑ پکڑ گئی اور اس کو عیسیٰ کا نائب سمجھنے لگے۔ وہ کافر وزیر عیسائیوں کا دینی پیشوا بن گیا اور حلوے میں لہسن کا پُٹ دینے لگا۔ جو لوگ اہلِ ذوق تھے وہ اس کی تقریر کی لذّت میں ایک طرح کی کڑواہٹ بھی پاتے تھے کیونکہ وہ بعض مطالب اس طرح چھپا کر بیان کرتا تھا جیسے گلقند میں زہر ملا ہُوا ہو۔ ایسی نیک بات کے دھوکے میں نہ آنا چاہیے جس کی تہ میں سو بُرائیاں چھپی ہوئی ہوں۔ جو لوگ صاحب علم و ذوق نہ تھے اُنھوں نے اس کی تقریروں کو گلے کا ہار بنا لیا تھا۔ یہاں تک کہ چھ برس تک بادشاہ سے الگ رہ کر وہ تمام عیسائیوں کا پیشوا بن گیا۔ صلاح

دین و دنیا کی تمام ذمہ داری مخلوق نے اسی پر ڈال دی اور اس کی ہاں نہ پر جان دینے لگی۔ باوجود اس کے بادشاہ سے پیام سلام جاری تھے اور بادشاہ اس کی کارروائیوں سے بالکل مطمئن تھا۔

آخر کار اپنی دلی مراد کے لیے بادشاہ نے خط لکھا کہ ای محسن یہود! اب تیرے کام کا وقت آن پہنچا، بہت جلد میرے دل کی کھٹک دور کر، میں تن من سے تیری نادر تدبیر کے چلن کا انتظار کر رہا ہوں لہٰذا جلد ان عیسائیوں کی الجھن سے مجھے نجات دے۔ وزیر نے جواب دیا کہ ای بادشاہ میں توڑ جوڑ میں ہوں کہ دینِ عیسوی میں فتنہ بپا ہو جائے۔

اس نصرانی قوم میں بارہ امیر بڑے زبردست تھے جو اپنے قبیلوں پر حکومت کرتے تھے اور کوئی آدمی اپنے امیرِ قبیلہ کے حکم سے سرتابی نہ کرتا تھا اور یہ بارہ کے بارہ امیر اس مکّار وزیر کے غلام ہو گئے تھے۔ سب کے سب اس کے قول کی تصدیق کرتے اور اس کے اعمال و افعال کی پیروی کرتے تھے اور اس کے اشارے پر جان دینے کے لیے تیار تھے۔

اب اس یہودی بچّے نے چالاکی یہ کی کہ ہر امیر کے نام ایک ایک وصیت نامہ اس اہتمام سے لکھا کہ ہر ایک میں طریقِ عبادات اور دین کے معارف ایک دوسرے سے مختلف بلکہ بالکل متضاد تھے۔ کسی میں ریاضت کرنے اور بھوکے رہنے کی ہدایت تھی اور توبہ و انابت کی شرط تھی تو کسی میں لکھا تھا کہ ریاضت بے کار ہے، اس راہ میں جود و سخا کے بغیر نجات نہیں۔ کسی میں لکھا کہ تیری بھوک پیاس اور تیری سخاوت یہ سب شرک ہے، سوائے توکل و تسلیم کے باقی سب مکر کے پھندے ہیں۔ کسی میں لکھا کہ آدمی پر خدمتِ خلق واجب ہے اور توکل کا خیال محض فریب ہے۔ کسی میں لکھا کہ یہ جو دین میں امر و نہی کے احکام ہیں یہ اس لیے

نہیں کہ ان پر عمل کیا جائے بلکہ اس لیے کہ ہمارا یہ عجز ہم پر ثابت ہو کہ ہم ان کی پوری پوری تعمیل نہیں کر سکتے اور اس طرح ہم پر خدا کی قدرت اور ہیبت طاری ہو۔ کسی میں لکھا کہ اپنا عجز مت دیکھ، اپنا عجز دیکھنا تو خدا کی دی ہوئی نعمت سے انکار کرنا ہے بلکہ اپنی قدرت و اختیار کو اسی کی دی ہوئی نعمت اور عینِ حق سمجھ۔ کسی میں لکھا کہ قدرت و نعمت ان دونوں پر توجہ نہ کر سوائے خدا کے جو کچھ آدمی کے پیش نظر ہو وہ بُت ہے۔ کسی میں لکھا کہ یہ عجز اور قدرت اور جہاں تک تیرا فکر پہنچے ان سب سے نظر پھیر لے کیوں کہ ہر دین والے اپنے اپنے نفس کی رہ نمائی میں چل کر ٹھوکریں کھاتے رہے۔ کسی میں لکھا کہ یہ غور و فکر جو مشاہدۂ حق کے لیے تو کرتا ہے یہ شمعِ راہ ہے اس کو کبھی بجھنے نہ دے، اگر تو مراقبے و مشاہدے کو ترک کر دے گا تو تیری شمعِ وصال آدھی رات کو تیرے ہی ہاتھوں گُل ہو جائے گی۔ کسی میں لکھا تھا کہ اس مراقبے و مشاہدے کی شمع کو بجھا دے کوئی خوف نہ کر تاکہ آخرت میں ایک کا بدلہ ایک لاکھ پائے۔ کسی میں لکھا کہ جو کچھ خدا نے تجھے عطا کیا اور تجھ پر اسے آسان کر دیا اس کو خوشی خوشی لے اور اپنے آپ کو امتحان میں مت ڈال۔ کسی میں لکھا کہ یہ سارا عالم ایک ہی ہے جو شخص خدا اور بندے کو الگ الگ دیکھتا ہے وہ بھینگا ہے۔ کسی میں لکھا کہ یہ کثرت ایک کیونکر ہو سکتی ہے ایسا گمان کرنے والا سوائے مجنون کے اور کون ہو سکتا ہے"

غرض اس قسم کے ایک دوسرے کی ضد بارہ وصیت نامے اس دینِ عیسوی کے دشمن نے لکھے۔ اس نے عیسیٰؑ کی یک رنگی کی بو بھی نہ سونگھی تھی مگر اس تیاری کے بعد اب انتہائی مکر یہ کھیلا کہ وعظ و نصیحت ترک کر کے تنہائی میں جا بیٹھا۔ چالیس پچاس دن تک جو چلّہ کیا تو مریدوں میں عام اضطراب پھیل گیا۔ تمام مخلوق اس کے حال، قال، ذوقِ عرفان اور اس کے دیدار کے شوق میں دیوانی

ہو گئی۔ بہتیری منت سماجت کی، روئے پیٹے مگر وہ شدّتِ ریاضت سے دہرا ہو گیا اور اندر ہی اندر سے جواب دیا کہ میری جان اپنے چاہنے والوں سے دُور تو نہیں لیکن باہر آنے کا دستور نہیں۔ تمام امیر مخلوق کی سفارش کے لیے جمع ہوئے اور مریدوں نے آہ وزاری شروع کی۔ وزیر نے جواب دیا کہ ای سخن پرست مسخرو! صرف زبان سے کان تک وعظ و پند کو قبول کرنے والو! ان ظاہری کانوں میں روئی کی ڈاٹیں ٹھونسو اور آنکھوں پر سے ظاہر کے ٹانکے توڑ دو، یہ ظاہری کان باطنی کانوں کی ڈاٹیں ہیں۔ جب تک ظاہری کان بہرے نہ ہوں باطنی کان نہیں کھلتے لہٰذا بالکل بے حس، بے گوش اور بے سمجھ ہو جاؤ تاکہ خدا سے خطاب ارجعی[1] سن سکو۔ اگر مجھے مانتے ہو تو میں اپنا آخری پیام تم تک پہنچا دوں گا لیکن اگر میرے کمال میں کچھ بھی شبہ ہی تو خود کیوں زحمت اُٹھاتے اور مجھے کیوں تکلیف پہنچاتے ہو۔ میں اس تنہائی سے ہرگز باہر نہ نکلوں گا کیوں کہ مراقبے و مشاہدے میں مشغول ہوں۔ سب نے عرض کیا کہ ای وزیر ہم کو تیرے حکم سے کوئی انکار نہیں ہی اور ہمارا کہنا غیریت کے ساتھ نہیں بلکہ ہماری حالت یہ ہی کہ تیرے فراق میں آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اور روح کی گہرائیوں سے آہ کے دھنوئیں بلند ہو رہے ہیں۔ بچّہ اپنی ماں یا انّا کی گود میں بُرائی بھلائی جانے بغیر بھی روتا ہی تو یہ اس کا رونا شکوہ و شکایت کی بنا پر نہیں ہوتا۔ وزیر نے اندر ہی اندر سے پکار کر کہا کہ ای میرے مریدو! تم کو معلوم ہو کہ مجھ کو عیسیٰؑ نے یہ حکم دیا ہی کہ اپنے سب مریدوں اور بہی خواہوں سے الگ ہو جاؤں، دیوار کی طرف رُخ کر کے تنہا بیٹھوں اور اپنے وجود سے بھی جُدائی اختیار کروں۔ بس اس سے زیادہ

---

[1] سورۂ فجر یاایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربّک راضیۃً مّرضیہ۔

کہنے کی اجازت نہیں اور مجھے گفت گو سے کام بھی نہیں ۔ اے دوستو! خدا حافظ، میں مر چکا ہوں اور چوتھے آسمان پر پہنچ چکا ہوں تاکہ آسمان آتشیں کے نیچے سوکھی لکڑی کی طرح نہ سلگوں ۔ بس اب میرا منشا یہ ہے کہ حضرت کے پاس چوتھے آسمان پر حاضر رہوں ۔

اس کے بعد ہر امیر کو الگ الگ بلا کر تنہائی میں بات چیت کی اور ہر ایک سے یہی کہا کہ دینِ عیسوی کا سچا پیرو اور میرا خلیفہ تو ہی ہے باقی سب امیر تیرے پیرو رہیں گے عیسیٰؑ مسیح کا حکم یہی ہے لہٰذا جو امیر تجھ سے سرتابی کرے اُس کو گرفتار کر کے یا مار ڈال یا قید کر دے لیکن جب تک میں مر نہ جاؤں یہ راز کسی پر ظاہر نہ کر ۔ اسی طرح ہر امیر کو الگ الگ اس نے وصیّت کی کہ دینِ خدا میں میرا نائب تیرے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے اور ہر ایک سے رازداری کا وعدہ لیا اور خلافت دے کر ایک ایک وصیّت نامہ دیا یہ سب وصیّت نامے حروفِ تہجّی کی طرح ایک دوسرے سے مختلف اور آپس میں متضاد تھے ۔

اس کام سے فارغ ہو کر دوسرے دن سے دروازہ بند کر کے پھر چلّے میں بیٹھ گیا اور اسی مدّت میں اپنے کو ہلاک کر لیا ۔ جب مخلوق اس کی موت سے آگاہ ہوئی تو اس کی قبر پر قیامت برپا ہو گئی ، اس کے دردِ فراق میں کیا امیر کیا غریب سب بے قرار ہو کر ماتم کرتے رہے ۔ آخر ایک ماہ کے بعد سب مرید جمع ہوئے اور امیروں کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا کہ اس کی گدّی پر بیٹھنے کا اہل کون ہے تاکہ ہم اس کو اپنا پیشوا بنائیں اور اس کی شفاعت و امداد کا دامن تھامیں ۔

اب ایک امیر قوم کے سامنے آیا اور دعویٰ کیا کہ اُس وزیر کا اور اس لیے خود عیسیٰؑ کا نائب میں ہوں ۔ دیکھو! یہ وصیّت نامہ میرے دعوے کا شاہد ہے کہ یہ نیابت میرا ہی حق ہے ۔ اس کے بعد دوسرا امیر مقابلے پر آیا اور اس نے بھی بغل

سے ایک وصیت نامہ نکالا اور خلافت کا دعویٰ کیا، یہاں تک کہ دونوں میں غصّہ
اور ضد پیدا ہوگئی اور اسی طرح بارہ کے بارہ امیروں نے اپنی اپنی ٹکڑیاں
الگ کر کے تلواریں سونت لیں۔ ہر امیر ایک ہاتھ میں تیغ اور دوسرے ہاتھ
میں وصیت نامہ لیے میدانِ جنگ میں اُترا اور مست ہاتھی کی طرح ایک
دوسرے کے مقابل ہوگیا۔ ہر قبیلے نے اپنے اپنے امیر کا ساتھ دیا اور
ان میں سخت جنگ ٹھن گئی۔ لاکھوں نصرانی اس جنگ میں ہلاک ہوئے یہاں تک
کہ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ مگر اس سے بھی بڑھ کر آفت یہ آئی کہ اُن کے
عقیدوں میں ہمیشہ کے لیے سخت اختلاف پیدا ہوگیا۔ وہ آپس ہی میں ایک دوسرے
کے دشمن ہوگئے اور اس نااتفاقی نے انھیں پھر کبھی ملنے نہ دیا، نہ اُن کے دین
کی کوئی وقعت اور قوت باقی رہی۔ صرف وہ گروہ جس نے خاتم المرسلین صلعم
کی پیشین گوئی کو سمجھا اور مبارک نام احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعظیم کی، اس
نام کی پناہ میں آگیا ورنہ دینِ عیسوی کے سب احکام خبط اور عقاید ایک معمّا
بن کے رہ گئے اور خردمندوں کی نظر سے گر گئے۔



ایک خرگوش کا شیر کو مکر سے ہلاک کرنا

کلیلہ دمنہ سے اس قصّے کو پڑھ اور اس میں سے اپنے حصّے کی نصیحت حاصل
کر۔ کلیلہ دمنہ میں جو کچھ تو نے پڑھا وہ محض چھلکا اور افسانہ ہے، اس کا مغز اب ہم
پیش کرتے ہیں۔

• ایک سبزہ زار میں چرندوں کی شیر سے ہمیشہ کش مکش رہتی تھی۔ چونکہ شیر
چرندوں کی تاک میں لگا رہتا تھا اس لیے وہ چراگاہ ان سب کو اجیرن ہوگئی تھی آخر

سب نے مل کر ایک تدبیر سوچی اور شیر کے پاس آکر کہا کہ ہم روزانہ تیرے کھانے کے لیے پیٹ بھر کے راتب مقرر کیے دیتے ہیں اس مقررہ راتب سے زیادہ شکار مت کر تاکہ یہ جنگل ہم پر تنگ نہ ہو جائے۔ شیر نے جواب دیا کہ اچھا اگر تم مکر نہ کرو اور اپنے قول قرار پر قائم رہو تو یہ بھی سہی۔ مگر میں تم جیسوں سے بہت بہت دھوکے کھا چکا ہوں، میں بہت سوں کے قول و فعل سے نقصان اُٹھا چکا ہوں اور بہت سے سانپ بچھو مجھے ڈس چکے ہیں۔ بہت کچھ بحث ہوئی۔ چرندے کہتے تھے کہ اے بہادر سورما جب تجھے گھر بیٹھے رزق پہنچتا ہے تو پھر خدا کا شکر بجا لا اور زیادہ کی ہوس میں تکلیف اور مشقت نہ اُٹھا کیونکہ تو ہزار ہاتھ پاؤں مارے، خدا نے جو نصیب میں لکھ دیا ہے اس سے زیادہ مل ہی نہیں سکتا۔ اسی لیے اللہ کے نیک بندوں نے توکّل کی تعلیم دی ہے۔ شیر نے جواب دیا کہ اللہ کے نیک بندوں نے تو ہمیشہ سخت محنت کی اور تکلیف اُٹھائی۔ یہ دنیا تلاش اور جستجو کا مقام ہے۔ علمِ الٰہی کے بھید بھی محنت اور کوشش ہی سے کھلے ہیں۔

غرض شیر نے وہ دلیلیں دیں کہ وہ جبری فرقہ لاجواب ہو گیا۔ لومڑی، خرگوش ہرن اور گیدڑ نے جبر کے طریق کو ترک کر دیا اور شیر سے عہد کیا کہ یہ بیعت کبھی نہ ٹوٹے گی۔ ہر روز کا شکار بے کھٹکے پہنچ جائے گا اور تقاضے کی نوبت نہ آئے گی۔ یہ معاہدہ کر کے وہ ایک چراگاہ میں پہنچے۔ سب مل کر ایک جگہ بیٹھے اور آپس میں گفتگو ہوئی۔ ہر ایک نئی تدبیر اور نئی رائے بتاتا تھا دوسرے کو کٹوانے کے درپے تھا۔ آخر کار یہ رائے طے ہوئی کہ قرعہ ڈالا جایا کرے قرعہ میں جس کا نام آجائے وہ بغیر کسی حیل حجّت کے شیر کی غذا کے لیے نامزد کیا جائے۔ ان سب نے اس طریقے کو تسلیم کیا۔ چنانچہ ہر روز جس کے نام کا قرعہ نکلتا وہ شیر کے پاس چپکے سے روانہ ہو جاتا تھا۔ جب اس قربانی کا دور خرگوش تک پہنچا تو خرگوش پکارا کہ کیوں صاحب، آخر یہ ستم کب تک

سہا جائے گا؟ چرندوں نے کہا کہ کتنی مدت سے ہم عہد کے مطابق اپنی جان فدا کر رہے ہیں۔ اے سرکش! ہم کو بدنام مت کر اور بہت جلد جا، ایسا نہ ہو کہ شیر ہم سے ناراض ہو جائے۔ خرگوش نے کہا کہ دوستو! مجھے اتنی مہلت دو کہ میری تدبیر تم کو ہمیشہ کے لیے مصیبت سے بچا دے۔ مجھے خدا نے ایک نئی چال سمجھا دی ہے اور کم زور جسم والے کو بڑی قوی رائے سے سرفراز کیا ہے۔ چرندوں نے کہا اے چالاک خرگوش! بھلا بتا تو سہی کہ تیری سمجھ میں کیا آیا ہے کہ تو شیر سے اُلجھتا ہے تو صاف صاف بیان کر کیونکہ مشورت سے فہم حاصل ہوتی ہے اور ایک عقل کو کئی عقلوں سے مدد ملتی ہے۔ خرگوش نے کہا کہ ہر راز بیان کے لائق نہیں ہوتا ایسا کرنے سے مبارک کام نامبارک ہو جاتا ہے اور کبھی نامبارک کام مبارک۔ غرض اس نے اپنا راز چرندوں سے بیان نہ کیا اور اپنا راز اپنی جان کے ساتھ لگائے رکھا۔ اس نے شیر کے سامنے جانے میں کچھ دیر لگائی اور اس کے بعد خونخوار شیر کے سامنے چلا گیا۔

دیر ہو جانے سے شیر غُرّا غُرّا کر زمین کو نوچے ڈال رہا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ دیکھا! میں نہ کہتا تھا کہ ان کمینوں کا عہد بالکل بودا ہے اور پورا ہونے والا نہیں۔ ان کی چکنی چپڑی باتوں نے مجھے گدھے سے بھی بدتر کر دیا۔ خیر دیکھوں تو یہ مخلوق کب تک دھوکے دیتی رہے گی۔ وہ غصّے میں گرج رہا تھا کہ ارے! ان دشمنوں نے کانوں کی راہ سے میری آنکھیں بند کر دیں۔ ان اہلِ جبر کے مکر نے مجھ کو بے دست و پا ہی نہیں کیا بلکہ میرے بدن کو لکڑی کی تلوار سے قیمہ کر دیا۔ آئندہ ان کی چاپلوسی میں کبھی نہ آؤں گا کہ وہ سب شیطانوں اور چڑیلوں کے بہکاوے ہیں۔

اتنے میں دیکھا کہ خرگوش دور سے آرہا ہے۔ خرگوش بالکل گستاخانہ بے خوف دوڑتا آرہا تھا اور اس میں بھی سرکشی کے انداز تھے۔ کیونکہ قاعدہ ہے کہ غم زدہ یا جھجکتی ہوئی چال پر شبہ ہو جایا کرتا ہے اور دلیرانہ چال پر کوئی اندیشہ نہیں کرتا۔

جب وہ آگے بڑھ کر نزدیک پہنچا تو شیر نے وہیں سے ڈانٹا کہ ای ناخلف! ارے میں نے کتنے بیلوں کو چیر ڈالا اور کتنے شیروں کو گوش مالی دے دی ہے، یہ آدھا خرگوش ایسا کہاں کا ہے جو اس طرح ہمارے فرمان کی خاک اُڑائے۔ ارے گدھے! اپنے خواب خرگوش کو ترک کر اس شیر کے غُرّانے کو غور سے سن۔

خرگوش نے عرض کی "اگر جان کی امان پاؤں تو ایک عذر پیش کروں"۔ شیر نے کہا "ابے بھونڈے بے وقوف بادشاہوں کے آگے سارا زمانہ آئینہ ہے، بھلا تو کیا عذر پیش کرے گا، تو مرغِ بے ہنگام ہے تیرا سر اُڑا دینا چاہیے، احمق کے عذر کو کبھی سننا بھی نہ چاہیے"۔

خرگوش نے کہا کہ "ای بادشاہ! ادنیٰ سے ادنیٰ رعیت کو بھی رعیت سمجھ اور مصیبت زدوں کی معذرت کو قبول فرما۔ یہ تیری شان و شکوہ کی زکوٰۃ ہوگی"۔

شیر نے کہا کہ "میں مناسب موقع پر کرم بھی کرتا ہوں اور جو شخص جس جامے کے لائق ہوتا ہے وہ اس کو پہناتا ہوں"۔

خرگوش نے عرض کی کہ "اگر تجھے عذر قبول ہے تو سن کہ میں صبح سویرے اپنے رفیق کے ساتھ بادشاہ کی حضور میں حاضر ہو رہا تھا (ان چرندوں نے) تیرے واسطے آج ایک اور خرگوش بھی میرے ساتھ کر دیا تھا۔ راستے میں ایک دوسرے شیر نے ہم غلاموں پر تاک لگائی میں نے اس سے کہا ہم شاہنشاہ کی رعیت ہیں اور اسی درگاہ کے غلام ہیں۔ اس نے کہا کہ بادشاہ کون ہوتا ہے تجھے کہتے ہوئے شرم نہیں آتی، ہمارے آگے کسی کا ذکر مت کر۔ اگر تو اس رفیق کے ساتھ میرے آگے سے ذرا بھی کترائی لے گا تو تجھ کو اور تیرے شاہنشاہ کو پھاڑ ڈالوں گا۔ میں نے کہا کہ ذرا مجھے اتنی ہی اجازت دیجیے کہ اپنے بادشاہ سلامت سے تمھاری خبر پہنچا کر چلا آؤں۔ اس نے کہا کہ اپنے ساتھی کو رہن کر دے ورنہ میرے مذہب میں تو قربانی ہے

ہم دونوں نے ہرچند خوشامد درامد کی مگر اس نے ذرا نہ سُنا۔ میرے ساتھی کو چھین لیا اور مجھے چھوڑ دیا۔ وہ ہمراہی اس کے پاس گرو ہوگیا اور مارے خوف کے اس کا دل خون ہوگیا۔ میرا ہمراہی تازگی اور مٹاپے میں مجھ سے تگنا اور نہ صرف جسم میں بلکہ خوبی اور خوبصورتی میں بھی کہیں بڑھا چڑھا ہے۔ القصہ اس شیر کی وجہ سے وہ راستہ بند ہوگیا۔ ہم پر جو کچھ بپتا پڑی وہ گوش گزار کی گئی۔ لہٰذا اے بادشاہ! اس حالت میں روزمرہ اپنا راتب پہنچنے کی امید نہ رکھ، سچی بات کڑوی ہوا کرتی ہے مگر میں نے تو سچ ہی کہہ دیا۔ اگر تجھے بروقت راتب چاہیے تو راستے کو صاف کر۔ ابھی میرے ساتھ چل اور اس نڈر شیر کو دفع کر۔" شیر نے کہا، "ہاں چلو، دیکھوں تو وہ کہاں ہے؟ اگر تو سچا ہے تو آگے آگے چل تاکہ اس کو اور اس جیسے سو بھی ہوں تو سزا دوں اور اگر تو نے جھوٹ کہا ہے تو اس کی سزا تجھے دوں۔"

خرگوش آگے آگے فوج کے نشان بردار کی طرح بڑھا تاکہ شیر کو اپنے مکر کے جال تک پہنچائے۔ ایک شکستہ کنوئیں کو پہلے ہی سے منتخب کرلیا تھا۔ دونوں وہاں تک پہنچ گئے مگر دراصل گھانس تلے کا پانی تو خود یہی خرگوش تھا۔ پانی گھانس پھونس کو تو بہالے جایا کرتا ہے، مگر تعجب یہ ہے کہ پہاڑ کو بھی بہالے جاتا ہے۔ خرگوش کے مکر کا جال شیر کے حق میں کمند ہوگیا۔ وہ خرگوش بھی عجیب دل گردے کا تھا کہ شیر کو اُڑا لے گیا۔ شیر جو خرگوش کے ساتھ تھا تو غصے میں بھرا ہُوا اور کینے کی آگ میں بھنک رہا تھا۔ دلیر خرگوش جو آگے آگے تھا اب اس نے آگے بڑھنے سے پانوں روکے۔ شیر نے دیکھا کہ ایک کنوئیں کے پاس آتے ہی خرگوش رکا اور پانوں پیچھے پیچھے ڈالنے لگا۔ شیر نے پوچھا "تو نے آگے بڑھتے ہوئے قدم پیچھے کیوں پھیر لیے، خبردار پیچھے مت ہٹ۔ آگے بڑھ۔" خرگوش نے کہا "میرے پانوں میں دم کہاں، میرے تو ہاتھ پیر پھول گئے، میری جان میں کپکپی پڑگئی اور دل ٹھکانے نہیں رہا۔ تو نہیں دیکھتا

کہ میرے چہرے کا رنگ سونے جیسا زرد پڑ گیا ہے، یہ میری دلی حالت کی خبر دیتا ہے"۔ شیر نے کہا "آخر سبب تو بتا کہ تو اس طرح کیوں جھجک رہا ہے؟ اے بیہودہ! تو مجھے چکمہ دیتا ہے، سچ بتا تو نے پاؤں آگے بڑھنے سے کیوں روکا؟" خرگوش نے کہا "اے بادشاہ وہ شیر اسی کنوئیں میں رہتا ہے۔ کنواں کیا ہے ایک قلعہ ہے جس میں وہ ہر آفت سے محفوظ ہے۔ میرے ساتھی کو چھین کر اسی کنوئیں میں لے گیا ہے"۔ شیر نے کہا اچھا تو آگے بڑھ کر دیکھ اگر وہ کنوئیں میں اب بھی موجود ہے تو میرے مقابلے سے مغلوب ہو جائے گا"۔ خرگوش نے کہا کہ "میں تو اس کے خوف کی آگ سے جلا جا رہا ہوں، البتہ اگر تو مجھے اُٹھا کر اپنی بغل میں لے لے تو نشاندہی کرنے کو حاضر ہوں تاکہ اے پہلوان! تیری ہمّت اور پشتی بانی کی ڈھارس پر میں آنکھیں کھولوں اور کنوئیں میں جھانک کر دیکھوں۔ میں تو صرف تمہاری ہمّت ہی سے کنوئیں کی طرف رُخ کر سکتا ہوں"۔

شیر نے اسے اپنی بغل میں اُٹھا لیا تو اس کی پناہ میں کنوئیں کے دہانے تک پہنچا۔ جب ان دونوں نے کنوئیں میں جھانکا تو شیر نے اس کی بات کی تصدیق کی۔ اصل میں کنوئیں کے پانی میں شیر نے اپنا ہی عکس اس طرح دیکھا کہ ایک شیر بغل میں خرگوش دبائے کھڑا ہے۔ جونہی اس نے پانی میں اپنے دشمن کو دیکھا، غصّے میں بے تاب ہو کر خرگوش کو تو چھوڑ دیا اور کنوئیں میں کود پڑا اور جو کنواں ظلم کا کھودا تھا اُس میں خود ہی گر گیا۔

جب خرگوش نے دیکھا کہ شیر کنوئیں میں بے دم ہو گیا تو قلا بازیاں کھاتا خوشی خوشی سبزہ زار کو دوڑا۔ وہ شیر کا شکاری چرندوں میں پہنچا اور کہا کہ "اے قوم! مبارک ہو، خوش خبری دینے والا آ گیا۔ اے عیش کرنے والو! خوش ہو جاؤ کہ وہ دوزخ کا کتّا پھر دوزخ کو سدھارا جس کو سوائے ظلم کے کچھ نہ سوجھتا تھا، مظلوم کی آہ اس

لگی اور وہ پارہ پارہ ہوگیا۔ اس کی گردن ٹوٹ گئی۔ سر پھٹ کر بھیجا نکل پڑا اور ہماری جانوں کو آئے دن کی مصیبت سے امان ملی۔ خدا کا فضل ہی کہ وہ نیست و نابود ہوگیا اور ایسے سخت دشمن پر ہمیں غلبہ حاصل ہوا۔

سب چرندے مارے خوشی کے اچھلتے کودتے اور قہقہے لگاتے ایک جگہ جمع ہوئے خرگوش کو شمع کی طرح بیچ میں لے کر سب نے سجدہ کیا اور کہا بے شک یا تو فرشتہ ہی یا جن ہی یا شیروں کا ملک الموت ہی۔ جو کچھ بھی تو ہی ہماری جان تجھ پر قربان ہی، تو نے ایسی فتح پائی ہی کہ بس یہ تیرے ہی زور بازو کا کام تھا۔ بھلا اس خوش خبری کا تفصیلی واقعہ تو سنا جس سے ہماری سوح کو تازگی اور دل کو غذا ملی ہی۔ اس نے کہا اے میرے بزرگو! یہ محض خدا کی تائید تھی ورنہ خرگوش کی کیا بساط ہی۔ خدا نے مجھے جرأت اور عقل کو روشنی بخشی اور اس عقل کی روشنی سے میرے ہاتھ پیر میں توانائی آئی۔ اے حضرات! یہ سب اسی کا فضل ہی۔ لہٰذا جان و دل سے خدا کی درگاہ میں سجدہ کرو (اور یہ دعا کرو) اے بادشاہوں کے بادشاہ! ہم نے ظاہری دشمن کو تو مار لیا لیکن اس سے بدتر دشمن ہمارے اندر موجود ہی۔ اس اندر کے دشمن کو مارنا عقل و تدبیر سے ممکن نہیں کیونکہ یہ خرگوش کے بس کا نہیں۔ ہمارا نفس دوزخ ہی اور دوزخ ایسی آگ ہی کہ سات سمندر پی کر بھی نہ بجھے اور اس کی بھڑک میں کوئی کمی نہ آئے۔



ہُدہُد کے دعوے پر کوّے کا طعنہ اور ہُدہُد کا جواب

جب سلیمانؑ کی بادشاہت کا ڈنکا بجا تو سب پرندے اطاعت میں حاضر ہوئے جب انھوں نے سلیمانؑ کو اپنا محرم راز اور زباں داں پایا تو ہر گروہ دل و جان سے حاضر دربار ہوگیا۔ سب پرندوں نے اپنی چوں چوں کرنی چھوڑ دی اور سلیمانؑ کی صحبت

میں بنی آدم[1] سے زیادہ فصیح بولنے لگے۔ سب پرندے اپنی اپنی حکمت و دانائی بیان کرتے تھے مگر یہ خودستائی کچھ شیخی کی وجہ سے نہ تھی بلکہ اپنی خلقت کا اظہار تھا کہ سلیمانؑ کو ہدایت و تعلیم کے پھیلانے میں مدد ملے۔ ہوتے ہوتے ہُد ہُد کی باری آئی اس نے کہا اے بادشاہ ایک ہنر جو سب سے ادنیٰ ہے عرض کرنا چاہتا ہوں کیوں کہ مختصر بات ہی مفید ہوتی ہے۔ سلیمانؑ نے پوچھا کہ وہ کون سا ہنر ہے؟ ہُد ہُد نے کہا کہ جب میں بلندی پر اُڑتا ہوں تو پانی کو پتال میں بھی ہو تو دیکھ لیتا ہوں۔ اس تفصیل کے ساتھ کہ یہ کہاں ہے، کس گہرائی میں اور اس کا کیا رنگ ہے، یہ بھی کہ وہ پانی زمین میں سے اُبل رہا ہے یا پتھر سے رس رہا ہے۔ اے سلیمانؑ! تو اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ مجھ ایسے واقف کار کو رکھ۔ حضرت نے کہا کہ اچھا بے آب و گیاہ اور خطرناک ریگستانوں میں تو ہمارے ساتھ رہا کر۔ تو ہماری ہمراہی بھی کرے اور پیش روی بھی تاکہ ہمارے لیے پانی کا کھوج لگاتا رہے۔

جب کوّے نے سُنا کہ ہُد ہُد کو یہ منصب عطا ہو گیا تو اسے حسد ہوا اور حضرت سلیمانؑ سے عرض کیا کہ ہُد ہُد نے بالکل غلط کہی اور گستاخی کی ہے۔ یہ خلافِ ادب ہے کہ بادشاہ کے حضور ایسا جھوٹا دعویٰ کیا جائے جس کا پورا کرنا ممکن نہ ہو۔ اگر ہمیشہ اس کی نظر اتنی تیز ہوتی تو مٹھی بھر خاک میں چھپا ہوا پھندا کیوں نہ دیکھ سکتا۔ جال میں کیوں پھنستا اور پنجرے میں کیوں گرفتار ہوتا۔ سلیمانؑ نے کہا، کیوں اے ہُد ہُد! کیا یہ سچ ہے کہ تو میرے آگے دعوے کرتا ہے اور وہ بھی جھوٹا۔ ہُد ہُد نے کہا، خدا کے واسطے اے بادشاہ! مجھ بے نوا فقیر کے خلاف دشمن کی لگائی بجھائی میں مت آ۔ اگر میرا دعویٰ غلط ہو تو

---

[1] افصح من اخیك - مولانا کا حاکمانہ طرزِ بیان ہے، اخیك یعنی تیرے بھائی، مراد بنی آدم۔

یہ سر حاضر ہی، ابھی گردن اُڑا دے ۔ رہی موت اور خدا کے حکم سے گرفتاری ، اس کا علاج میرے کیا کسی کے پاس بھی نہیں ہی۔ اگر خدا کی مشیت میری عقل کی روشنی کو نہ بجھائے تو میں اُڑتے اڑتے پھندے اور جالے کو دیکھ لوں ۔ لیکن جب حکم الٰہی ہوتا ہی تو عقل سو جاتی ہی ۔ چاند سیاہ ہو جاتا ہی اور آفتاب گہن میں آ جاتا ہی ۔ میری عقل اور بینائی میں یہ قوت نہیں ہی کہ خدائی حکم کا مقابلہ کر سکے ۔

حضرت عمرؓ کے پاس سفیرِ قیصر کا آنا

قیصر کا ایک سفیر دُور دراز بیابانوں کو طے کرکے حضرت عمرؓ سے ملنے کو مدینے پہنچا ۔ لوگوں سے پوچھا کہ خلیفہ کا محل کون سا ہی تاکہ میں وہاں اپنا خیمہ و خرگاہ پہنچاؤں ۔ لوگوں نے جواب دیا کہ اس کا کوئی محل نہیں اس کا روشن قصر تو اس کا دل ہی۔ اس کی حکومت و شہریاری کا ساری دنیا میں شہرہ ہی لیکن وہ خود درویشوں کی طرح گھاس پھوس کی جھونپڑی میں رہتا ہی ۔ اے بھائی! تجھے اس کا محل کیا دکھائی دے گا جبکہ تیرے دل کی آنکھ میں[۱] بال نکل آئے ہیں ۔ پہلے دل کی آنکھ سے بیاری کے بال صاف کرلے پھر کہیں اس کے محل کے دیکھنے کی آرزو کر ۔ جب سفیرِ روم نے یہ باتیں سنیں تو اور زیادہ مشتاق ہو گیا ۔ خیمہ و خرگاہ کو بے نگرانی چھوڑ کر حضرت عمرؓ کی ہر طرف تلاش کرنے لگا ۔ قاعدہ ہی کہ دُھن سچی ہو تو ڈھونڈنے والا مطلب پا ہی جاتا ہی ۔ ایک اعرابی کی عورت نے کہا کہ دیکھو! عمرؓ اس کھجور کے درخت کے نیچے ہیں ۔ ساری مخلوق سے الگ ہو کر وہ ظلّ اللہ درخت کے سائے میں سو رہا ہی ۔ سفیر اُدھر بڑھا

---

[۱] مُراد یہ بال کی بیاری ۔

تو دور ہی ٹھٹک کر رہ گیا اور حضرت عمرؓ کو دیکھ کر اس کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ ہرچند آپ سو رہے تھے مگر سفیر پر ہیبت طاری ہو گئی اور اسی کے ساتھ روح میں ایک سُرُور کی کیفیت پیدا ہوئی۔ اگرچہ محبّت اور ہیبت ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن اس نے یہ دو ضدیں اپنے دل میں جمع پائیں۔ اپنے جی میں کہنے لگا کہ میں نے کتنے بادشاہوں کی شان و شوکت دیکھی ہے اور بڑے بڑے درباروں میں سرفرازی حاصل کی ہے۔ کسی بادشاہ کی ہیبت مجھ پر اتنی نہیں چھائی جتنی کہ اس مرد کے رعب نے میرے ہوش اُڑا دیے۔ میں شیروں کے بَن میں بھی پھرا ہوں مگر کبھی ایسا خوف زدہ نہیں ہوا۔ میں نے جنگوں اور بڑی بڑی مہموں میں صفیں کی صفیں اُلٹ دی ہیں۔ میں نے بڑے بڑے زخم کھائے بھی ہیں اور لگائے بھی ہیں ہمیشہ دوسروں کے مقابلے میں میرا دل مضبوط رہا۔ مگر یہ شخص جو بے ہتیار زمین پر پڑا سوتا ہے، کیا سبب ہے کہ اسے دیکھ کر میری بوٹی بوٹی لرز رہی ہے۔ یہ اس گدڑی والے فقیر کی ہیبت نہیں ہو سکتی۔ یہ ضرور حق کی ہیبت ہے مخلوق کی نہیں۔

وہ دل ہی دل میں یہ باتیں کر رہا تھا کہ حضرت عمرؓ خواب سے بیدار ہوئے۔ سفیر نے آگے بڑھ کر سلام عرض کیا۔ آپ نے جواب دے کر آگے طلب کیا اور تسلّی دے کر اپنے پاس بٹھایا۔ اس کے ویران دل کو آباد کیا۔ بہت سی معرفت کی باتیں سمجھائیں۔ گویا شوقین شاگرد کو کامل اُستاد ملا۔ سفیر نے دریافت کیا کہ اے امیر المومنین! جان سی لطیف سی عالمِ بالا سے عالمِ اسفل میں کیسے اُتر آئی اور نامحدود عالم کا پرندہ گھٹے ہوئے پنجرے میں کیسے بند ہو گیا؟ حضرت نے فرمایا کہ جنابِ باری کے حکم میں وہ لذّت اور ترغیب ہے کہ بے گنتی وجود وجد کی حالت میں عدم کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔

سفیر نے جب یہ نکتے سنے تو اس کے دل میں ایک نئی روشنی پیدا ہوئی اس نے پھر سوال کیا کہ اس میں فائدہ اور حکمت کیا تھی کہ لطیف روح اس کثیف خاک

میں قید ہوگئی صاف پانی کا کیچڑ میں جذب ہوجانا اور روح باقی کا فانی اجسام میں گرفتار ہونا (ایک سی بات ہی) حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ای عزیز تو چاہتا ہی کہ تیری ہر بات میں معنی بندھے ہوئے ہوں - آزاد ولطیف مطالبِ کو لفظوں میں قید کرنا ایسا ہی جیسے ہوا کو چند آوازوں میں بند کرلینا - یہ کام تو نے ایک فائدے کی خاطر کیا ہی لیکن خود یہ فائدہ تیرے منشا کو کہاں دیکھ سکتا ہی - پس جب ہم کو اس فعل میں فائدے نظر آتے ہیں تو وہ ذات جس نے تمام فائدے پیدا کیے ہیں اپنے فعل میں کیا کیا فوائد نہ دیکھتی ہوگی - اب اگر گفتگو کا کوئی فائدہ نہیں ہی تو زبان بند کرلے اور اگر واقعی فائدہ مند ہی تو اعتراض چھوڑ اور خدا کا شکر بجالا +



ایک مقید طوطی کا ہندوستان کے طوطیوں کو پیغام بھیجنا

ایک سوداگر کے پاس ہندوستان کا خوب صورت طوطی تھا - ایک مرتبہ سوداگر نے سامانِ سفر تیار کرکے ہندوستان جانے کا قصد کیا - رخصت ہوتے وقت گھر کے سب نوکروں تک سے پوچھا کہ ہر ایک کے لیے کیا کیا تحفے لائے جائیں - ہر ایک نے اپنی اپنی پسند عرض کی - اس نے سب سے وعدہ کیا اور طوطی سے بھی دریافت کیا کہ مجھے ملکِ ہندوستان جانا پڑ گیا ہی تو بتا تیری فرمایش کیا ہی؟ طوطی نے کہا جب تو وہاں کے طوطیوں کو دیکھے تو میرا حال یوں بیان کر کہ تمھاری قوم کا فلاں طوطی جو تمھاری ملاقات کی مشتاق ہی، گردشِ آسمان سے ہماری قید میں ہی - تم کو اُس نے سلام کہا اور اپنی خلاصی کا مشورہ طلب کیا ہی - کہنا، ممکن ہی کہ میں تمھارے اشتیاق ہی اشتیاق میں ختم ہوجاؤں اور فراق میں جان دے دوں - کیا یہ انصاف ہی کہ میں قیدِ سخت میں گرفتار رہوں اور تم

کبھی سبزے پر اور کبھی درخت پر مزے اُڑاؤ۔ کیا دوستوں کے آئین وفا ایسے ہی ہوتے ہیں کہ میں اس قید میں گرفتار اور تم خوش بخت باغوں میں آزاد پھرو۔

سوداگر نے وعدہ کیا کہ اس کا پیام سلام اس کی قوم تک پہنچا دے گا۔ جب ہندوستان کی حدود میں پہنچا تو جنگل میں چند طوطیوں کو دیکھا۔ گھوڑا روک کر آواز دی اور اپنے طوطی کا سلام اور وہ پیغام جو امانت تھا انھیں پہنچا دیا۔ ان طوطیوں میں سے ایک طوطی تھرتھر کانپ کر گر پڑا اور اس کا سانس اُکھڑ گیا۔ مالک طوطی یہ خبر دے کر بہت پشیمان ہوا اور جی میں کہنے لگا کہ میں نے ناحق ایک جان لی۔ شاید یہ ہمارے طوطی کا عزیز تھا۔ میں نے اپنی بے موقع بات سے اس غریب کو پھونک دیا۔ القصہ جب سوداگر کاروبارِ تجارت سے فارغ ہو کر اپنے وطن واپس آیا تو ہر غلام کے لیے تحفہ لایا اور ہر لونڈی کو ہدیہ دیا۔ طوطی نے پوچھا کہ میری فرمایش بھی پوری کی، کیا کہا اور کیا دیکھا، بیان کر۔ سوداگر نے کہا کہ نہیں میرا جی نہیں چاہتا، میں خود کہہ کر پشیمان ہوں، اپنا ہاتھ چباتا اور اُنگلیاں کاٹتا ہوں کہ بیہودگی سے ایسا بُرا پیغام بالکل بے سمجھی اور بھولے پن سے کیوں لے گیا۔ طوطی نے کہا ای، میرے مالک! پشیمانی کاہے کی! وہ ایسی کون سی پشیمانی ہی جس نے اس قدر غصہ اور غم پیدا کر دیا ہی۔ سوداگر نے کہا کہ تیرے ہم جنس طوطیوں کے گروہ سے میں نے تیری داستان بیان کی۔ ان میں سے ایک طوطی تیرا درد آشنا نکلا (پیغام سنتے ہی) اس کا پِتّا پھٹ گیا، کانپ کر گرا اور مر گیا۔ میں از حد پشیمان ہوا کہ پیغام ہی کیوں دیا لیکن جب مُنہ سے نکل گیا تو پشیمانی بے فائدہ ہی۔ سوداگر کے طوطی نے جب یہ قصہ سنا تو وہ بھی تھرتھرا کر گرا اور ٹھنڈا ہو گیا۔ مالک نے طوطی کو اس حال سے گرا ہوا پایا تو کھڑا ہو گیا اور ٹوپی زمین پر پٹخ دی۔ رنج و غم کے مارے اپنا گریبان چاک کر دیا۔ بین میں کہتا تھا کہ ای خوب صورت اور خوش

آواز طوطی ۔ ارے یہ تجھے کیا ہو گیا، تو ایسا کیوں ہو گیا ۔ ہائے ہائے تو ایسا تھا اور تو ویسا تھا ۔ آخر جب رو پیٹ چکا تو اس کو پنجرے سے باہر پھینک دیا ۔ فوراً ہی طوطی اُڑ کر ایک بلند ڈالی پر جا بیٹھا ۔ اس مردہ طوطی نے اس طرح کی پرواز کی جیسے آفتاب مشرق سے دھاوا کرتا ہی ۔ مالک پرندے کی اس حرکت پر حیران رہ گیا، بھلاوے میں پڑا ہؤا تھا یکایک پرندے کے چلتر جو دیکھے تو سراُونچا کر کے اس سے مخاطب ہؤا اور کہا کہ ای میرے بلبل ! اپنے حال کی تفصیل میں سے کچھ حصّہ ہم کو بھی دے ۔ ہندوستان کے طوطی نے کیا رمز کیا جس کو تو بھانپ گیا اور ہماری آنکھوں پر اپنے مکر سے پردہ ڈال دیا ۔ تو نے وہ چال کھیلی کہ ہم کو جلایا اور خود روشن ہو گیا ۔ طوطی نے کہا کہ اس نے اپنے عمل سے مجھے یہ نصیحت کی کہ نغمہ، آواز، خوش دلی کو ترک کر کیونکہ تو اپنی صدا کے باعث ہی گرفتار ہؤا ہی صرف نصیحت کی غرض سے اس نے اپنے کو مردہ بنالیا ۔ یعنی ای پرندے تو جو عام و خاص کا دل بہلانے والا گویا ہی تو مردہ بن جا تاکہ قید سے خلاصی پائے ۔ پھر طوطی نے سلام کر کے کہا بس اب خدا حافظ ای میرے مالک ! الوداع ۔ تو نے بڑی مہربانی کی کہ مجھے اندھیری قید سے آزاد کر دیا ۔ مالک (سوداگر) نے کہا، خدا کی امان، جا ۔ تو جاتے جاتے مجھ کو ایک نیا راستہ دکھا گیا ۔ طوطی نے وطنِ اصلی کا رُخ کیا ۔ ایک مدّت صعوبتِ سفر اُٹھانے کے بعد آسایش و آرام سے رہنے لگا ۔ ادھر مالک نے اپنے جی میں کہا، میرے لیے اب مصلحت یہی ہی کہ طوطی کا راستہ اختیار کروں کہ وہ بالکل روشن اور صاف ہی ۔

طوطی کے مرنے سے مراد نفس کو مارنا ہی ۔ دیکھ، موسم بہار میں بھی پتھر سرسبز نہیں ہوتا لہٰذا تو خاک ہو جا تاکہ تجھ سے رنگ برنگ کے پھول کھلیں ۔ سالہا سال تو سخت پتھر بنا رہا، تھوڑی سی دیر کے لیے خاک ہو کر بھی آزمایش کر ۔

ایک بوڑھے چنگی کا گورستان میں خدا کے واسطے چنگ بجانا

تم نے سنا ہو گا کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایک مطرب چنگ بجانے والا بڑا باکمال گزرا ہے۔ بلبل اس کی آواز سے مست ہو جاتے تھے۔ اس کی دلکش آواز کی ایک مینڈ میں سے سو آوازیں نکلتی تھیں۔ جہاں وہ گاتا تھا وہاں لوگ مورہ جاتے تھے اور اس کی دردناک آواز سے قیامت برپا ہو جاتی تھی۔ اسی طرح زمانہ گزرتا گیا اور وہ بڈھا ہو گیا حتیٰ کہ تان میں جان نہ رہی اور اس کے نغمے میں مچھروں کی سی بھنبھناہٹ پیدا ہو گئی۔ گھڑے کے پیندے کی طرح اس کی پیٹھ خم اور گھوڑوں کی دمچی کی طرح بھویں آنکھوں پر لٹک پڑیں۔ وہ رسیلی آواز بالکل بے سُری، بھدی اور دل خراش ہو گئی۔ وہ دردانگیز الاپ جس پر زہرہ کو بھی رشک آتا تھا بڈھے گدھے کی آواز کی مانند ہو گئی کہ اب اس کا کوئی قدردان نہ رہا اور رفتہ رفتہ وہ بالکل مفلس اور روٹی کپڑے تک کو محتاج ہو گیا۔ اسی پریشانی میں اس نے ایک روز درگاہِ الٰہی میں مناجات کی کہ اے بارِ الٰہ تو نے اپنے ذلیل بندے پر بڑے بڑے کرم کیے۔ عمرِ دراز بھی عطا کی اور اپنے عادات و اطوار درست کرنے کی مہلت بھی دی۔ میں نے ستر سال تک گناہ کیا پھر بھی تو نے کسی دن مجھ سے اپنی بخشش واپس نہ لی لیکن آج میرے پاس کمائی میں سے کچھ نہیں ہے، آج میں تیرا مہمان ہوں۔ چونکہ میں تیرا ہوں اس لیے چنگ بھی اب تیرے ہی حضور میں بجاتا ہوں۔ چنگ لیا اور خدا کی تلاش میں روتا ہوا مدینے کے قبرستان میں پہنچا اور کہا کہ آج میں صلے کا طالب صرف خدا سے ہوں جو اپنے احسان و کرم سے کھوٹے سکّے بھی قبول کر لیتا ہے۔ چنگ جی کھول کر بجایا اور روتے

لہ سارنگی کی قسم کا ایک ساز چنگ بجانے والے کو چنگی کہتے ہیں۔

روتے روتے سر جھکا کر ایک قبر پر پڑ گیا۔ اسی حالت میں آنکھ لگ گئی۔ دنیا کے رنج اور بدن کی آفتوں سے آزاد، ایک نامحدود جہان اور صحرائے جان میں پھرنے لگا۔ اسی وقت خداوند تعالیٰ نے حضرت عمرؓ پر یکایک ایسی نیند غالب کی کہ وہ بھی حیرت میں ہو گئے کہ میرا معمول تو ایسا نہیں ہے، یہ غیبی واقعہ ہے اور ضرور اس میں کوئی بھید ہے۔ تکیے پر سر رکھ کر سو گئے، خواب میں حق کی طرف سے ندا آئی جس کو ان کی جان نے سنا کہ اے عمرؓ ہمارے ایک بندے کی حاجت روا کر کے اس کا صلہ ادا کر۔ ہمارا ایک خاص اور معزز بندہ ہے ذرا تو قبرستان تک تکلیف کر اور بیت المال سے پورے سات سو دینار لے اور اس کے پاس جا کر کہہ کہ اے ہمارے دست گرفتہ اس وقت تو یہ لے لے اور اس کو خرچ کر جب یہ ختم ہو جائے تو پھر یہیں آجا۔

آواز کی ہیبت سے عمرؓ کی آنکھ کھل گئی۔ فوراً تعمیل پر کمر باندھی اور قبرستان کا رُخ کیا۔ بغل میں ہمیانی دبائے ڈھونڈنے نکلے۔ قبرستان میں کئی چکر لگائے وہاں اس بوڑھے کے سوا اور کوئی دکھائی نہ دیا۔ ہر دفعہ اسی بوڑھے پر خیال جاتا تھا۔ مگر پھر اپنے جی میں کہتے تھے کہ یہ نہ ہوگا یہاں تک کہ تھک گئے اور سوائے اسی بوڑھے کے اور کوئی وہاں نظر نہ آیا۔ جی میں سوچا کہ خدا نے تو یہ فرمایا کہ ہمارا خاص بندہ بہت پاک، لائق اور خوش نصیب ہے بھلا چنگی بوڑھا خاصۂ خدا کیوں کر ہو سکتا ہے دوبارہ پھر قبرستان کے گرد چکر لگایا جیسے شکاری شیر جنگل کے اطراف گھوما کرتا ہے۔ جب یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو یہ بوڑھا ہی ہے تو دل میں کہا، بے شک تاریکی میں بھی بہت سے روشن دل ہوتے ہیں۔ قریب آئے اور باادب وہاں بیٹھ گئے۔ جونہی ایک چھینک حضرت عمرؓ کو آئی وہ بوڑھا اُٹھ بیٹھا۔ حضرت کو دیکھ کر حیران رہ گیا چاہا کہ چلا جائے مگر خوف سے پاؤں کانپنے لگا۔ اپنے جی میں کہنے لگا، اے خدا تجھ سے فریاد کرتا ہوں کہ محتسب بوڑھے چنگی کے سر پر آن پہنچا۔ حضرت عمرؓ

نے اس سے کہا کہ مت ڈر اور مجھ سے نہ بھاگ کہ میں خدا کی طرف سے تیرے لیے خوش خبریاں لایا ہوں - خداوندِ عالم نے تیری وہ تعریف فرمائی کہ حضرت عمرؓ کو تیرا گرویدہ بنا دیا - خدا نے تجھے سلام کہا ہے اور پوچھا ہے کہ اب تیرا کیا حال ہے - لے یہ چند سکّے تیرا صلہ ہیں انھیں خرچ کر اور پھر یہیں آجانا - جب یہ سُنا تو بوڑھے کی عجب حالت ہوئی ، اپنے ہاتھ کاٹنے اور پیچ و تاب کھانے لگا - بے اختیار چلّا کر کہا کہ اے بے مثل و نظیر خدا ! یہ بے وسیلہ بوڑھا مارے شرم کے پانی پانی ہوگیا - جب روتے روتے بے حال ہوگیا تو چنگ کو زمین پر اس زور سے دے مارا کہ ٹکڑے ٹکڑے کر دیا - کہا ، اے (چنگ) تو ہی خدا کے اور میرے درمیان حجاب رہا ہے اور تو ہی نے سیدھے راستے سے مجھے پھیرا ہے - اے خطا بخش و خطا پوش خدا ! میرے گناہ معاف اور میری گزشتہ زندگی پر رحم کر - اسی طرح روتا چلّاتا اپنے گناہ دُہرا رہا تھا - یہ حال دیکھ کر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تیری مدہوشی بھی تیری ہوشیاری کی علامت ہے - پھر آپ نے اس کو توجہ دی کہ گزشتہ کے رنج اور توبہ کے مقام سے نکل کر معرفت میں محو ہوگیا - گویا ایک جان گئی اور دوسری زندگی کا آغاز ہوا ✦

ایک اعرابی کا خلیفۂ بغداد کے پاس کھاری پانی بطور تحفہ لے جانا

اگلے زمانے میں ایک خلیفہ تھا جس نے حاتم کو بھی اپنی سخاوت کے آگے بھکاری بنا دیا تھا اور دنیا میں اپنی داد و دہش اور فیضِ عام سے حاجت مندی اور ناداری کی جڑ اکھیڑ دی تھی - مشرق سے مغرب تک اس کی بخشش کا چرچا ہوگیا - ایسے بادشاہ کریم کے زمانے کی ایک داستان سنو ! ایک رات اعرابی عورت

نے اپنے شوہر سے کہاکہ ہم ہر قسم کی محتاجی اور تکلیف برداشت کر رہے ہیں، سارا عالم خوش ہی اور ہم ناخوش۔ روٹی کھانے کو میسّر نہیں ہمارا کھانا پینا تو درد اور آنسو ہیں۔ ہمارا لباس دن کی دھوپ ہی اور سوتے وقت رات ہماری توشک ہی اور چاندنی لحاف ہی۔ چاند کے ہالے کو گول چپاتی سمجھ کر ہمارا ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھ جاتا ہی ہمارے فقر وفاقہ سے فقیروں کو بھی شرم آتی ہی، ہمارے دن رات روٹی کی فکر ہی میں گزرتے ہیں۔ جیسے سامری آدمیوں کی صحبت اور آبادی سے وحشت کرتا تھا اسی طرح اپنے بیگانے ہم سے دور بھاگتے ہیں۔

میاں نے کہا یہ شکایتیں کب تک کیے جائے گی، ہماری عمر ہی ایسی کیا زیادہ رہ گئی ہی بہت بڑا حصّہ گزر چکا۔ عقلمند آدمی مفلسی اور فارغ البالی کو خاطر میں نہیں لاتا کیونکہ دونوں حالتیں پانی کی موج ہیں آئیں اور گزر گئیں۔ موج دریا چاہے ہلکی ہو چاہے تیز جب کسی دم اسے قرار ہی نہیں تو پھر اس کا ذکر ہی کیا؟ جو بہت آرام و عیش سے جیتا ہی وہ بہت بُری طرح مرتا ہی۔ تو تو میری بیوی ہی، بیوی کو اپنے شوہر کا ہم خیال ہونا چاہیے تاکہ آپس کے اتفاق سے سب کام ٹھیک ہوں۔ جوتی کا جوڑا باہم ایک سا ہی مناسب ہوتا ہی۔ اگر جوتے اور موزے کا جوڑ اپہننے کے لیے بنایا جائے تو کیسا بدزیب ہوگا۔ میں تو دل مضبوط کیے قناعت کی طرف جارہا ہوں تو حرص و ہوس کی طرف کیوں جارہی ہی؟

وہ مرد قانع خلوص اور ہمدردی سے اس قسم کی نصیحتیں بیوی کو دیتا رہا۔ بیوی نے جھلّا کر ڈانٹا کہ او بے غیرتی کے دیندار میں آیندہ تیری باتوں میں نہ آؤں گی خالی خولی دعوے اور پند و نصیحت کی بکواس مت کر۔ تونے کب قناعت سے جان روشن کی، تو نے تو قناعتوں کا نام سیکھ لیا ہی۔ تو خدا کا نام بیچ میں ڈال کر مجھے چکمہ دیتا ہی تاکہ (جب میں شکوہ کروں) تو مجھے گستاخی اور فساد کے الزام میں

بدنام کرے۔ تیری نصیحت نے مجھے لاجواب نہیں کیا، ہاں نامِ حق نے مجھے بند کردیا۔ مگر تُف ہی تجھ پر کہ تو نے نامِ حق کو چڑی مار کا پھندا بنالیا۔ نامِ حق ہی میرا بدلہ تجھ سے لے گا۔ میں نے تو جان وتن نامِ حق کے حوالے کردیا۔ تاکہ میرے زخموں کی چرپراہٹ تیری رگِ جاں تک پہنچائے یا تجھ کو بھی میری طرح قیدی (عورت) بنادے۔ عورت نے اس قسم کی صلواتوں کے دفتر کے دفتر شوہر کو سُنا دیے۔ مرد عورت کے طعنے چپ چاپ سُنتا رہا۔ اس کے بعد دیکھو تو جواب کیا دیتا ہی۔ مرد نے کہا کہ ای عورت! تو میری بیوی ہی کہ بیچا۔ لڑائی جھگڑے اور بدگوئی کو چھوڑ اور اگر نہیں چھوڑتی تو مجھے چھوڑ۔ میرے کچے پھوڑوں پر ڈنک نہ مار اور میری بے خود جان پر زخم نہ لگا۔ اگر تو زبان بند کرے تو خیر، ورنہ یاد رکھنا میں ابھی گھربار چھوڑ دوں گا۔ تنگ جوتا پہننے سے ننگے پانو پھرنا بہتر ہی۔ ہر وقت کی خانہ جنگی سے سفر کی مصیبت جھیلنی اچھی۔

عورت نے جب دیکھا کہ وہ بالکل بدمزاج اور گرم ہوگیا ہی تو جھٹ رونے لگی۔ ظاہر ہی کہ رونا عورت کا زبردست جال ہی۔

پھر عاجزی سے کہنے لگی، میاں! میں تیری بیوی نہیں تیرے پانو کی خاک ہوں۔ میں تجھے ایسا نہ سمجھی تھی بلکہ مجھے تو تجھ سے دوسری ہی امید تھی۔ جسم وجان اور جو کچھ بھی میں ہوں سب کا تو ہی مالک ہی اور تو ہی میرا فرماں روا ہی۔ اگر فقر وفاقے کی وجہ سے میرا دل مقامِ صبر سے ہٹا بھی ہی تو یہ اپنے لیے نہیں بلکہ تیرے لیے ہی۔ تو میری سب مصیبتوں اور بیماریوں کی دوا بنا رہا ہی اس لیے میرا جی نہیں چاہتا کہ تو بے سروسامان رہے۔ تیری جان کی قسم یہ شکوہ وشکایت اپنے لیے نہیں بلکہ یہ آہ وواویلا تیرے لیے ہی۔ تو جُدائی کی باتیں جو کرتا ہی یہ ٹھیک نہیں، جو چاہے کر مگر یہ نہ کر۔

اس طرح کی باتیں کہتی رہی اور روتے روتے اوندھے منہ گر پڑی۔ اس بارش میں سے ایک بجلی چمکی اور مرد کے دل پر اس کی ایک چنگاری جھڑی۔ مرد اپنی گفتگو کی پشیمانی سے ایسا درد مند ہوا جیسے مرتا ہوا کوتوال اپنے سابقہ ظلم کی یاد سے۔ جی میں کہنے لگا کہ جب اپنی جان کا میں شوہر ہوں تو اپنی جان کو میں نے لاتیں کیوں ماریں۔ پھر اس سے کہا، اے عورت! میں اپنے کیے پر پشیمان ہوں اگر پہلے میں کافر تھا تو اب مسلمان ہوتا ہوں۔ میں تیرا گنہگار ہوں میری معذرت قبول کر تیری مخالفت سے باز آیا۔ اب تجھے اختیار ہے تیغ میان سے نکال۔ جو کچھ تو کہے گی وہی بجا لاؤں گا بدی نیکی غرض جو کچھ نتیجہ نکلے اس پر توجہ نہ کروں گا۔ میں تیرے وجود میں فنا ہو جاؤں گا، کیونکہ میں محب ہوں اور محبت اندھی اور بہری ہوتی ہے۔ عورت نے کہا کہ آیا یہ عہد تو نیکی کے ساتھ کر رہا ہے یا ایک حیلہ نکال کے میرے دل کا بھید لے رہا ہے؟ مرد نے کہا اُس خدا کی قسم جو تمام بھیدوں کا جاننے والا ہے جس نے خاک سے آدمؑ جیسے پاک نبی کو پیدا کیا، اگر تیرے پاس میری یہ درخواست تیرا امتحان کرنے کی غرض سے ہے تو ذرا اس امتحان کو بھی آزما کر دیکھ۔ عورت نے کہا، دیکھ! آفتاب چمک رہا ہے اور ایک عالم اس سے روشن ہے۔ خدا کا خلیفہ اور رحمٰن کا نائب جس سے شہرِ بغداد نو بہار بنا ہوا ہے اگر تو اس بادشاہ سے ملے تو خود بھی بادشاہ ہو جائے، اقبال مندوں کی دوستی بجائے خود کیمیا ہے بلکہ ان کی ادنیٰ سی توجہ کے آگے کیمیا بھی کیا چیز ہے احمد صلعم کی نظر ابوبکرؓ پر پڑ گئی۔ وہ ایک تصدیق میں صدیق ہو گئے۔ مرد نے کہا کہ بھلا میں بادشاہ کی نظر میں کیسے آسکتا ہوں، کسی بہانے کے بغیر اُدھر کا رخ بھی نہیں کر سکتا عورت نے کہا کہ ہمارے مشکیزے میں برساتی پانی بھرا رکھا ہے، تیری ملک اور اور سروسامان جو کچھ ہے یہی ہے۔ اس پانی کے مشکیزے کو اُٹھا کر لے جا اور اس نذر کے ساتھ شاہنشاہ کے حضور پیش ہو اور عرض کر کہ ہماری جمع پونجی اس کے سوا اور کچھ نہیں،

بے آب وگیاہ ریگستان میں اس سے بہتر پانی نہیں مِلتا۔ چاہے اس کا خزانہ موتی اور جواہر سے لبریز ہو لیکن ایسا پانی اس کے خزانے میں نایاب چیز ہی۔ مرد نے کہا اچھی بات ہی۔ مشکیزے کا منہ بند کر دیکھ تو یہ نذرانہ ہمیں کیسا فائدہ پہنچاتا ہی۔ تو اس کو نمدے میں سی دے تاکہ بادشاہ اسی سوغات سے روزہ کھولے۔ ایسا پانی دُنیا بھر میں کہیں نہیں۔ یہ تو نتھری ہوئی شراب ہی۔

پس اس مردِ عرب نے مشکیزہ اُٹھایا اور سفر میں دن کو رات اور رات کو دن کر دیا۔ ہرج مرج کے وقت مشکیزے کی حفاظت کے لیے بے قرار ہو جاتا تھا۔ اس نگہبانی کے ساتھ بیابان سے شہر تک لایا۔ ادھر عورت نے جانماز بچھائی اور گڑگڑا گڑگڑا کر اے پروردگار حفاظت کر! اے پروردگار حفاظت کر! کا وظیفہ پڑھنے لگی۔

عورت کی دعا اور اپنی محنت وسعی سے آخر وہ عرب چوروں اور چھوکروں کے پتھروں سے، بچتا بچاتا صحیح سلامت دارالخلافہ تک مشکیزہ لے گیا۔ وہاں دیکھا کہ ایک بارگاہ عالی شان اور نہایت وسیع بنی ہوئی ہی اور اہلِ غرض اپنے پھندے بچھائے حاضر ہیں۔ ہر طرف کے دروازوں سے اہلِ حاجت آتے اور اپنی مُراد پاتے ہیں۔ جب اعرابی دور و دراز بیابان سے اس بارگاہ تک پہنچا تو نقیب آئے اور مہربانی والتفات کا گلاب اس کے منہ پر چھڑکنے لگے۔ شاہی نقیب بے کہے اس کی ضرورت کو سمجھ گئے، ان کا کام ہی یہ تھا کہ سوال سے پہلے عطا کریں۔ ان نقیبوں نے پوچھا کہ اے عرب کے شریف! تو کہاں سے آرہا ہی؟ اور مصائب و آلام سے کیا حال ہو گیا ہی؟۔ اس نے کہا اگر تم مجھے عزت دو تو میں شریف ہوں اور اگر منہ پھیر لو تو بالکل بے عزت ہوں۔ اے امیرو! تمھارے چہروں پر امارت برستی ہی، تمھارے چہروں کا آب و رنگ کچے سونے سے

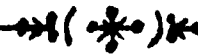
زیادہ خوش رنگ ہی۔ میں مسافر ہوں ریگستان سے بادشاہ کے کرم وبخشش کی امید پر آیا ہوں۔ اُس کی خوبیوں کی خوشبو بیابانوں تک پہنچی ہی۔ ریت کے ذرّوں تک میں جان آگئی ہی۔ یہاں تک تو میں اشرفیوں کی خاطر آیا تھا مگر جب یہاں پہنچا تو اس کے دیدار کے لیے بے قرار ہوگیا۔ میں اس دروازے پر ایک مادّی چیز کی طلب میں آیا تھا، مگر جب اس دہلیز پر پہنچ گیا تو خود ہی صدر ہو گیا۔ پھر اس مشکیزے کو پیش کر کے کہا کہ یہ ہدیہ حضور سلطان میں پہنچاؤ اور بادشاہی سوالی کو ضرورت وحاجت سے بے نیاز کردو اور عرض کرو کہ یہ میٹھا پانی سوندھی مٹی کے گھڑے کا ہی جس میں برساتی پانی جمع کیا گیا تھا۔ نقیبوں کو اس کی اس تعریف پر ہنسی آنے لگی لیکن اُنھوں نے جان کی طرح اس مشکیزے کو اُٹھالیا کیونکہ بیدار مغز اور نیک دل بادشاہ کی خوبو سب ارکانِ سلطنت میں اثر کرگئی تھی۔

جب خلیفہ نے دیکھا اور اس کا حال سُنا تو اس کے مشکیزے کو اشرفیوں سے بھر دیا۔ ایسے انعام واکرام اور خلعت دیے کہ وہ عرب بھوک پیاس کو بھول گیا۔ پھر ایک نقیب کو اس دریائے کرم بادشاہ نے اشارہ کیا کہ یہ اشرفیوں بھرا مشکیزہ اس کے ہاتھ میں دیا جائے اور واپسی میں اس کو دریائے دجلہ کے راستے روانہ کیا جائے، وہ بڑے طول طویل راستے سے آیا ہی اور دجلہ کی راہ سے بہت نزدیک ہو جاتا ہی۔ کشتی میں بیٹھے گا تو ساری اگلی تھکن بھی بھول جائے گا۔ نقیبوں نے یوں ہی کیا، اس کو اشرفیوں سے بھر کر مشکیزہ دے دیا اور دجلہ پر لے پہنچے۔ جب وہ عرب کشتی میں بیٹھا اور دجلہ دیکھا تو مارے شرم کے اس کا سر جُھک گیا۔ سجدے میں گر کے کہنے لگا داتا کی دین بھی نرالی ہی اور اس سے بھی زیادہ عجیب یہ ہی کہ اس نے میرے تلخ پانی کو قبول کر لیا۔ اس دریائے جود نے میری خراب اور کھوٹی جنس کو بغیر پس وپیش کیے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

نحوی اور کشتی بان

ایک نحوی کشتی میں بیٹھا اور خود پرستی سے کشتی بان سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ تم نے کچھ بھی نحو پڑھی ہے۔ کشتی بان نے کہا، نہیں، نحوی نے کہا کہ افسوس تو نے اپنی آدھی عمر ضائع کی۔ کشتی بان مارے غصّے کے پیچ و تاب کھانے لگا مگر اس وقت خاموش رہا۔ اتفاقاً ہوا کے جھکڑ نے کشتی کو ایک بھنور میں لا ڈالا۔ کشتی بان نے نحوی سے بآوازِ بلند کہا کہ حضرت! آپ کو تیرنا بھی آتا ہے یا نہیں۔ نحوی نے کہا نہیں مجھے تیرنا نہیں آتا۔ کشتی بان نے کہا کہ اے نحوی! تیری ساری عمر ضائع گئی کیونکہ کشتی اب گرداب میں ڈوبنے والی ہے۔

اس کہانی کی غرض یہ ہے کہ آدمی کو کسی ایک علم یا فن میں کمال حاصل ہو جانے پر شیخی نہ کرنی چاہیے۔



ایک قزوینی کا گوندا لگوانا اور سوئی کے کچوکوں کی تاب نہ لانا

ایک روایت سنو کہ اہلِ قزوین میں رسم ہے کہ جسم کے مختلف حصّوں جیسے ہاتھ، بازو پر شیر، چیتے وغیرہ کی تصویریں اتروا کر گوندا لگواتے ہیں۔ ایک حجام کے پاس قزوینی گیا کہ مجھے گوندا لگا اور منہ مانگی اُجرت لے۔ حجام نے پوچھا کہ اے پہلوان گوندا کس شکل کا لگاؤں، اس نے کہا کہ بہت ہی بپھرے ہوئے شیر کا۔ چونکہ میرا طالع شیر کا ہے اس لیے نقش بھی شیر کا چاہیے اور بہت خوب صورت لگا اور نیلا رنگ خوب گہرا بھر دے۔ حجام نے پوچھا کہ اچھا! شیر کی تصویر کہاں گودوں، کہا شانے پر گود تاکہ جنگ کے میدان اور راگ رنگ کی محفل میں ایسے بپھرے

ہوئے شیر کی تصویر سے میری ہمت بڑھے اور پختہ ارادہ پیدا ہو۔

جب حجام نے سوئی چبھونی شروع کی تو اس کے شانے میں درد ہونے لگا پہلوان نے چیخ پکار شروع کی کہ بھلے آدمی تو نے تو مجھے مار ہی ڈالا، یہ تو کس طرح گود رہا ہے۔ حجام نے کہا کہ آپ نے تو شیر کی تصویر گودنے کو کہا تھا نا! پہلوان نے جھلّا کر کہا، آخر تو نے کس عضو سے ابتدا کی۔ حجام نے کہا کہ میں نے دُم سے شروع کیا، پہلوان نے کہا کہ دُم کو چھوڑ دے۔ اس کی دُم سے میرا سانس اندر کا اندر اور باہر کا باہر رہ گیا ای شیر بنانے والے اگر شیر بے دُم کا بھی ہو تو کیا ہرج ہے کیونکہ نشتروں کے چبھنے سے میرا دل ڈوبا جاتا ہے۔ تب حجام نے نقش کے دوسرے رُخ سوئی مارنی شروع کی پہلوان بلبلا اُٹھا اور کہا کہ شیر کا یہ کون سا عضو گود رہا ہے۔ حجام نے کہا کہ حضرت! یہ تو صرف اس کا کان ہے۔ قزوینی نے کہا کہ ہمارے شیر کے کان نہ ہونے چاہییں اس لیے تو کان گودنا چھوڑ دے۔ حجام نے نقش کے ایک تیسرے رُخ سوئی چبھونی شروع کی۔ قزوینی نے پھر دُہائی دی کہ یہ شیر کے جسم کا کون سا حصّہ ہے حجام نے کہا کہ یہ پیٹ کا حصّہ ہے۔ پہلوان نے کہا کہ مجھے شیر کے پیٹ کی بھی ضرورت نہیں کیونکہ خود میں پیٹ کے درد سے مرا جاتا ہوں۔ اگر شیر کے نقش میں سے پیٹ نکال بھی دیا جائے تو کیا ہرج ہے۔

حجام کا چہرہ مارے غصّے کے تمتمانے لگا اور بہت دیر تک اُنگلی دانتوں میں دبائے حیران رہا۔ آخر زمین پر سوزن پھینک کر کہا کہ دنیا میں کسی کو بھی ایسا سابقہ پڑا ہے۔ بھلا بے دُم اور بے سر اور بے پیٹ کا شیر کس نے دیکھا ہے۔ ایسا شیر تو خدا نے بھی نہیں پیدا کیا۔

شیر، بھیڑیے اور لومڑی کا مل کر شکار کو نکلنا

شیر، بھیڑیا اور لومڑی مل کر شکار کی تلاش میں پہاڑیوں پہاڑیوں نکل گئے اگرچہ شیرِ نر کو ان کی ہمراہی سے شرم آتی تھی لیکن کشادہ دلی کو کام میں لا کر ساتھ لے لیا۔ ایسے بادشاہ کو لاؤ لشکر زحمت کا باعث ہوتا ہے لیکن جب لشکر ساتھ ہو گیا تو پھر جماعت رحمت ہے۔ جب وہ جماعت کوہستان میں بڑے تزک اور شان شوکت سے شیر کے ساتھ گئی تو ان کو جنگلی گائے، جنگلی بکرا اور خرگوش بہت موٹے تازے ہاتھ آئے اور ان کی جرأت بڑھ گئی۔ جو جنگ جُو شیر کے ساتھ ہوتا ہے اسے دن رات اچھے کھانے ملتے ہیں۔ غرض جب وہ اپنا تازہ تازہ شکار پہاڑ سے اُتار کر میدان میں لائے تو بھیڑیے اور لومڑی کو طمع پیدا ہوئی اور جی میں کہنے لگے کہ شکار کی تقسیم انصاف کے ساتھ ہونی چاہیے۔ ان کی طمع کا عکس شیر کے دل پر بھی پڑا اور وہ ان کی نیت تاڑ گیا لیکن اس بات کو ظاہر نہ کیا مگر اپنے جی میں کہا کہ بھلا اے بھکاریو! میں تم کو اس کی سزا دوں گا۔ تمھیں میرا اطمینان نہ ہوا بلکہ تم کو میری داد و دہش پہ بدگمانی ہوئی۔

پس شیر نے کہا، اے پُرانے بھیڑیے! تو ہی عدالت کا طریقہ تازہ کر۔ شکار تقسیم کرنے کی خدمت پر میں تجھے اپنا نائب مقرر کرتا ہوں تاکہ تیری قابلیت ظاہر ہو۔ بھیڑیے نے کہا کہ اے بادشاہ! جنگلی گائے تیرا حصّہ ہے کیونکہ تو بھی بڑا ہے اور بکرا میرا حصّہ کہ بکرا بیچ راس کا شکار ہے اور خرگوش بے کھٹکے لومڑی کو دے دینا چاہیے۔ شیر نے کہا، اے بھیڑیے اس کا جواب دے کہ میرے سامنے تو نے اپنے کو ہم اور مجھ کو تو کیسے کہا۔ بھیڑیا کون کتا ہے جو مجھ جیسے بے مثل و نظیر شیر کے آگے خود بینی کرے۔ پھر اُسے آگے بلایا اور جب وہ سامنے آیا تو ایک پنجہ

مارا اور پھاڑ ڈالا اور کہا کہ جب میری حضوری بھی اس کی خودی کو دور نہ کر سکی تو ایسے کو وہاں مارنا چاہیے جہاں پانی نہ ملے اس کے بعد شیر نے لومڑی کی طرف رُخ کیا اور کہا کہ کھانے کے لیے اس شکار کو تو تقسیم کر۔ لومڑی آداب بجالا کر گویا ہوئی کہ ای شاہ ذی جاہ یہ موٹی گائے تو حضور کے صبح کے خاصے کے واسطے ہے اور یہ بکرا دوپہر کی یخنی کے لیے اور یہ خرگوش بھی شام کو حضور کی ٹھنگار کے کام آئے گا۔ شیر نے کہا کہ ای لومڑی تو نے عدل کو روشن کر دیا، ایسی تقسیم تو نے کس سے سیکھی۔ ای معزز لومڑی! سچ بتا تو نے یہ ترکیب کہاں سے اُڑائی، لومڑی نے عرض کی، ای جہاں پناہ! میں نے بھیڑیے کے حال سے عبرت پکڑی۔ شیر نے کہا کہ جب تو نے ہمارے لیے اپنی ذات مٹا دی تو یہ تینوں شکار تو ہی لے جا۔ ای لومڑی! جبکہ تو ہماری ہو چکی تو ہم بھی تیرے ہیں اور سب شکار بھی تیرے ہیں، اب چاہے آسمان ہفتم پر قدم رکھے، سب منظور۔ تو نے ذلیل بھیڑیے کے انجام سے عبرت پکڑی تو لومڑی کاہے کو ہے تو میری شیر ہے۔

لومڑی نے خدا کا شکر ادا کیا کہ مجھے بھیڑیے کے بعد بلایا گیا۔ اگر پہلے پہل مجھ کو حکم دیتا کہ شکار تقسیم کر تو جان کیونکر بچتی۔

پس خدا کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ اس نے ہم کو اگلوں کے بعد پیدا کیا اور ہم نے گزشتہ قوموں پر خدا کی سزاؤں کو سُنا تاکہ ہم ان اگلے بھیڑیوں کے انجام سے آگاہ ہو کر لومڑی کی طرح اپنے درجے کو مدِ نظر رکھیں۔ حضرت رسولِ برحق نے اپنی حدیث شریف میں ہم کو اُمتِ مرحومہ اسی لیے فرمایا کہ اے بھلے مانسو! اگلے بھیڑیوں کی ہڈیوں اور اکھڑے ہوئے بالوں کو دیکھ کر عبرت پکڑو۔ عاقل آدمی جب شاہانِ فراعنہ اور قومِ عاد کا انجام سُنتا ہے تو اپنے دماغ سے غرور و نخوت نکال دیتا ہے اور اگر باوجود اس کے بھی غرور و نخوت دُور نہ کرے تو دیکھنے والے اس کی گمراہی سے سبق لیتے ہیں ✦

ایک شخص کا درِ محبوب کی کُنڈی کھٹکھٹاتا اور "میں ہوں" کہنا

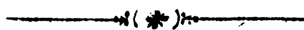
ایک شخص درِ محبوب پر آیا اور کُنڈی کھٹکھٹائی۔ محبوب نے پوچھا کون صاحب ہیں! جواب دیا کہ "میں ہوں" محبوب نے کہا، چل دُور ہو ابھی ملاقات نہیں ہوسکتی۔ تجھ جیسی کچی چیز کی اس دسترخوان پر کوئی جگہ نہیں۔ ہجر و فراق کی آگ کے بغیر کچی جنس کیسے پک سکتی ہے جو اس کے ظاہر و باطن کو ایک کردے چونکہ ابھی تک تیری "توئی" تجھ میں سے نہیں گئی ہے اس لیے تجھے ابھی غم کی آگ میں تپنا چاہیے۔ یہ جواب سُن کر وہ بے چارہ درِ محبوب سے اُلٹا پھرا اور سال بھر تک جُدائی کی آگ کے چرکے کھاتا رہا۔ جل جلا کر خوب پکا ہوگیا تو دوبارہ واپس آیا اور محبوب کی بارگاہ کے اطراف صدقے ہونے لگا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اور بڑے ادب سے پھر کُنڈی کھٹکھٹائی کہ کہیں کوئی بے ادبی کا لفظ منہ سے نہ نکل جائے۔ محبوب نے اندر سے آواز دی کہ دروازے پر کون ہے۔ اس نے جواب میں عرض کیا اے دل رُبا تو ہی ہے۔ محبوب نے حکم دیا کہ اب جب کہ تو میں ہی ہے تو اندر چلا آ کیونکہ ایک ذات میں دوئی کی گنجایش نہیں۔ جب ایک ہی ایک ہو تو پھر دوئی نہ صرف مٹ جاتی ہے بلکہ میں پن اور تو پن کے دونوں اشارے جاتے رہتے ہیں +



ایک دوست کا حضرت یوسفؑ سے ملنے آنا اور حضرت یوسفؑ کا اس سے ہدیہ طلب کرنا

ایک مہربان دوست کسی پرے مُلک سے آیا اور یوسف صدیقؑ کا مہمان ہُوا۔ چونکہ دونوں کھیل کود کے زمانے کے یار تھے اس لیے یارانے کے گاؤ تکیے پر ٹیکا لگا کر بیٹھے۔ دوست نے یوسفؑ کے بھائیوں کے ظلم اور حسد کا تذکرہ کیا، آپ نے جواب دیا کہ

وہ واقعہ زنجیر تھا اور میں شیر اور یہ ظاہر ہے کہ شیر کی زنجیر میں جکڑے جانے سے کوئی بے عزتی نہیں ہوتی۔ اگر شیر کی گردن میں زنجیر پڑی ہوئی ہو تو بھی وہ سب گرفتاروں کا صدر ہوتا ہے۔ مہمان نے پوچھا کہ تم پر قید خانے اور کنوئیں میں کیا گزری، جواب دیا کہ جیسی چاند گہن اور زوال کی راتوں میں چاند پر گزرتی ہے۔ جب وہ پوچھ گچھ چکا تو یوسفؑ نے پوچھا کہ ارے میاں! تو میرے لیے کیا تحفہ لایا وہ تو لا۔ دوستوں کے دروازے پر خالی ہاتھ آنا ایسا ہی جیسے پون چکی پر بے گیہوں کے جانا۔ وہ دوست مارے شرم کے اس تقاضے سے رو ہنار ہو گیا مگر یوسفؑ کا اصرار بڑھتا ہی گیا کہ میرے لیے جو سوغات لایا ہے، وہ دکھا۔ آخر دوست نے کہا کہ میں نے تیرے تحفے کے لیے بہتیرا سوچا مگر کوئی تحفہ تیرے لائق میری نظر میں نہ جچا۔ بھلا میں ایک دانہ جواہر کو اتنی بڑی کان میں کیا لاتا اور ذرا سے قطرے کو ایسے بڑے دریا تک کیا پہنچاتا۔ اور اگر اپنا دل و جان تیرے لیے تحفہ لاؤں تو وہ بھی ایک زیرے[1] کو ملکِ کرمان میں پہنچانے کے برابر ہے۔ البتہ تیرا حسن وہ وصف ہے جس کی مثال نہیں۔ اس لیے مجھے مناسب یہی معلوم ہوا کہ نور سینہ کی مانند میں ایک آئینہ تیرے حضور میں لاؤں۔ تو جو آسمان کی شمع یعنی سورج کی طرح سارے عالم کی شمع ہے میں تیرے لیے ایک آئینہ لایا ہوں تاکہ تو اپنی موہنی صورت اس میں دیکھے اور جب کبھی تو اپنی صورت اس میں دیکھے تو مجھے یاد کرے۔ یہ کہہ کے اس نے بغل سے آئینہ نکالا اور حضرت یوسفؑ کے سامنے پیش کر دیا کیونکہ قاعدہ ہے کہ حسینوں کے سامنے آئینہ آتا ہے تو پھر وہ اسی میں مشغول ہو جاتے ہیں +



[1] زیرہ ملک کرمان میں بکثرت کاشت ہوتا ہے اور ساری دنیا میں وہاں سے جاتا ہے۔

صنعتِ نقاشی میں چینیوں اور رومیوں کا مقابلہ

چینیوں کو اپنی نقاشی پر گھمنڈ تھا اور رومیوں کو اپنے کمال کا غرّہ ۔ سلطان نے حکم دیا کہ میں تم دونوں کا امتحان کروں گا ۔ چینیوں نے کہا کہ بہت بہتر ہم اپنی جان لڑا دیں گے رومیوں نے بھی عرض کیا کہ ہم بھی اپنا کمال دکھا دیں گے ۔ الغرض اہلِ چین و اہلِ روم میں مقابلہ ٹھہر گیا ۔ چینیوں نے رومیوں سے کہا کہ اچھا ایک مکان ہمارے حوالے کرو اور ایک تم لو ۔ دو مکان آمنے سامنے تھے ان میں سے ایک چینیوں کو ملا اور دوسرا رومیوں کو چینیوں نے سینکڑوں قسم کے رنگوں کی فرمایش کی ۔ بادشاہ نے مخزن کا دروازہ کھول دیا ۔ ہر صبح چینیوں کو وہاں سے رنگوں کا راتب ملنے لگا ۔ رومیوں نے کہا کہ ہم نہ کوئی نقش بنائیں گے اور نہ رنگ لگائیں گے ، بلکہ اپنا کمال اس طرح دکھائیں گے کہ زنگ باقی نہ رہے ، چنانچہ انھوں نے دروازہ بند کرکے صیقل کرنی شروع کی اور آسمان کی طرح بالکل سادہ اور شفاف گھوٹا کر ڈالا اور اُدھر چینی اپنے کمال و ہنرمندی سے فارغ ہوکر خوشی کے شادیانے بجانے لگے ۔ بادشاہ نے آکر چینیوں کا کام دیکھا اور اُن کے عجائباتِ نقش و نگار کو دیکھ کر دنگ رہ گیا ۔ اس کے بعد رومیوں کی طرف آیا ، انھوں نے اپنے کام پر سے پردہ اُٹھایا ۔ چینیوں کی تصاویر و تماثیل کا عکس ان گھوٹا دی ہوئی دیواروں پر پڑا جو کچھ چینیوں نے نقاشی کی تھی وہ اسی گھوٹا کی ہوئی دیوار پر اس قدر خوب صورت معلوم ہوئی کہ آنکھوں کو حدقۂ چشم سے باہر کھینچے لیتی تھی ۔

اے فرزند! رومیوں کی مثال اُن با خدا صوفیوں کی سی ہے جو نہ کتبِ دین پڑھے ہوئے ہیں نہ فضیلت علم و ہنر رکھتے ہیں لیکن انھوں نے طمع ، حرص ، بخل اور کینے وغیرہ کے زنگ سے اپنے سینوں کو مانجھ کر ایسی صیقل کرلی ہے کہ ان کے دل صاف شفاف آئینہ ہوگئے ہیں جس میں ازلی حسن کا جو صورت سے پاک ہے نقش اُتر آتا ہے

غلاموں کا لقمان پہ الزام لگانا کہ سب عمدہ میوے کھا گیا

حضرت لقمان ایک شخص کے غلام تھے، وہ امیر اپنے تمام غلاموں میں لقمان ہی کو بہت کم زور اور بد رؤ پاتا تھا۔ وہ امیر سب غلاموں کو میوہ چننے کے لیے باغ روانہ کیا کرتا تھا۔ لقمان بھی ان سب غلاموں کے ساتھ ساتھ جاتے تھے۔ سر سے پیر تک عقل مجسم مگر صورت کالی رات کی طرح سیاہ تھی۔ وہ غلام جو میوے جمع ہوتے ان میں سے خود بھی کھا جاتے تھے۔ ایک بار امیر کو خبر ہوگئی اس نے دریافت کیا تو غلاموں نے جواب دیا کہ لقمان کھا گیا، امیر لقمان پر خفا ہوا اور ان پر سختی کرنے لگا: جب حضرت لقمان نے عرض کی کہ اے مالک! خدا کے پاس بے ایمان بندے کی بخشائش نہیں لہٰذا بہتر یہ ہے کہ آزمایش کی جائے، اس کی صورت یہ ہے کہ گرم پانی سب کو پلایا جائے اور ایک جنگل میں تو سوار ہو کر گھوڑا دوڑا اور ہم سب تیرے گھوڑے کے ساتھ دوڑیں۔ اس کے بعد بھیدوں کے کھولنے والے خدا کی امداد سے تو اصلی چور کو پا جائے گا۔

امیر نے گرم پانی تیار کرایا اور سب غلاموں کو خوف کے مارے پینا پڑا اور پھر ان کو جنگلوں اور کشت زاروں میں خوب دوڑایا۔ اس دوڑ دھوپ سے ان کا جی ماش کرنے لگا اور آخر کار سارا کھایا پیا نکل گیا اور لقمان کو جو قے ہوئی تو وہ بالکل صاف ہوئی اور اس کے معدے سے صرف پانی نکلا۔

جب لقمان کی حکمت یہ کچھ کر سکتی ہے تو مالک الملک کی حکمت کھوٹے کھرے کو الگ کر دکھانے میں کیا کچھ نہیں کر سکتی۔

ایک شہر کو آگ لگنی حضرت عمرؓ کے زمانے میں

حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت میں ایک شہر کو آگ لگی وہ اس بلا کی آگ تھی کہ پتھر کو خشک لکڑی کی طرح جلا کر راکھ کر دیتی تھی۔ وہ مکانوں اور محلوں کو خاک سیاہ کرتی ہوئی پرندوں گھونسلوں اور آخر کار ان کے پروں میں بھی لگ گئی۔ اس آگ کے شعلوں نے آدھا شہر لے ڈالا یہاں تک کہ پانی بھی ان شعلوں کی تاب نہ لاتا تھا۔ اہلِ تدبیر ان پر پانی اور سرکے کے پرنالے بہاتے تھے مگر معلوم ہوتا تھا کہ پانی اور سرکہ آگ بھڑکانے میں اور مدد پہنچاتا ہے۔ آخر کار خلقت حضرت عمرؓ کے پاس دوڑی آئی اور عرض کی کہ ہماری آگ کسی پانی سے نہیں بجھتی۔ آپ نے فرمایا کہ یہ آگ خدا کے غضب کی علامات سے ہے اور یہ تمہارے بخل کی آگ کا صرف ایک شعلہ ہے۔ لہٰذا پانی کو چھوڑو اور روٹی تقسیم کرو اور آئندہ کے لیے اگر میرے متبع ہو تو بخل کو ترک کرو۔ خلقت نے کہا ہم نے پہلے سے دروازے کھول رکھے ہیں اور ہم ہمیشہ سے صلۂ رحم کرنے والے اور سخی رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ وہ سخاوت تم نے از روئے رسم و عادت کی تھی تم نے خدا کی راہ میں دروازہ نہیں کھولا تھا۔ تم نے جو کچھ دیا وہ شیخی اور اپنی بڑائی دکھانے کے واسطے دیا خدا کے خوف اور عاجزی سے نہیں دیا۔ اور ایسی دکھاوے کی سخاوت اور خیرات سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔



حضرت علیؓ پر ایک کافر کا تھوکنا اور آپ کا اس کے قتل سے باز رہنا

حضرت علیؓ کے عمل سے اخلاص کا طریق سیکھ۔ وہ خدا کے شیر تھے اُن کا فعل نفسانیت سے پاک تھا۔ ایک جنگ میں جب ایک دشمن زد میں آیا تو آپ تلوار سونت کر جھپٹے۔ اس نے حضرت علیؓ کے چہرۂ پُر نور پر جو ہر نبی و ولی کا فخر تھے تھوک دیا۔ اس نے ایسے چہرے پر

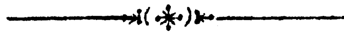
تھوکا کہ اگر چاند بھی مقابل آئے تو اس کے سامنے سجدہ بجالائے مگر حضرت علیؓ اپنا غصّہ پی گئے اور اسی وقت تلوار پھینک کر اس کافر پہلوان سے کنارہ کرنے لگے۔ وہ پہلوان آپ کی اس حرکت سے حیران ہو گیا کہ بھلا اظہارِ عفو اور رحم کا یہ کیا محل تھا! اس نے پوچھا کہ تم نے مجھ پر ابھی تو شمشیرِ آبدار کھینچی اور ابھی کے ابھی تلوار پھینک کر مجھے چھوڑ دیا اس کا کیا سبب ہے۔ میری جنگ آزمائی میں تم نے ایسی کیا بات دیکھی کہ مجھ پر غالب آنے کے بعد بھی مقابلے سے ہیٹے ہو گئے۔ آپ نے فرمایا کہ میں صرف خدا کے لیے تلوار مارتا ہوں کیونکہ خدا کا بندہ ہوں اپنے نفس کا بندہ نہیں ہوں میں خدا کا شیر ہوں، خواہشاتِ نفس کا شیر نہیں ہوں اور یہی میرا عمل میرے دین کا گواہ ہے غضب و غصّہ بادشاہوں پر حکمراں اور ہمارا غلام ہے اس لیے غضب و غصّہ پر میں نے زین لگام لگا لی ہے میرے صبر کی تلوار نے میرے غضب و غصّہ کی گردن مار دی ہے اور حق کا غضب بھی مجھ پر رحمت کی طرح چھایا ہوا ہے۔ حضرت پیغمبر صلعم نے میرے نوکر کے کان میں فرمایا کہ ایک دن وہ میرا سر تن سے جدا کر دے گا۔ وہ نوکر مجھ سے کہتا رہتا ہے کہ آپ پہلے ہی مجھے قتل کر دیجیے کہ ایسی سنگین خطا مجھ سے سرزد نہ ہونے پائے مگر میں اسے یہی جواب دیتا ہوں کہ جب میری موت میرے ہاتھ سے ہونے والی ہے تو میں خدا کے حکم کے مقابلے میں حیلہ کیوں تراشوں اس طرح میں دن رات اپنے قاتل کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں مگر مجھے اس پر غصّہ نہیں آتا کیونکہ جس طرح آدمی کو جان پیاری ہے اسی طرح مجھے موت پیاری ہے کیونکہ یہی موت میری دوسری زندگی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے ہے۔ بے موت مرنا ہم پر حلال ہے اور بے سامان جینا ہمارے لیے نعمت ہے۔

پھر حضرت امیر المومنینؓ نے اس پہلوان سے کہا کہ اے جوان جب کہ جنگ آزمائی کے وقت تو نے میرے منہ پر تھوکا تو میرے نفس کو حرکت ہوئی اور میری نیت دوسری ہو گئی یعنی جنگ کی غرض و غایت آدھی خدا واسطے اور آدھی اپنے نفس کی طرف سے ہو گئی حالانکہ خدا کے کام میں دوسرے کی شرکت جائز نہیں۔ تو میرے مالک کے ہاتھ

کی بنائی ہوئی صورت ہے اور تو اس کی ملک ہے میری نہیں۔ خدا کے نقش کو خدا ہی کے حکم سے توڑنا چاہیے اور دوست کے شیشے پر اسی کا پتھر مارنا چاہیے۔

اس کافر پہلوان نے جو یہ تقریر سنی تو اس کے دل میں ایک نور پیدا ہوا اور اس نے زنار توڑ ڈالا اور کہا کہ ہائے افسوس میں اب تک ظلم کے بیج بو رہا تھا میں تو تجھے کچھ اور سمجھتا تھا لیکن تو خدا کا اندازہ لگانے کی نہ صرف ترازو ہے بلکہ ہر ترازو کی ڈنڈی ہے۔ میں اس شمع کی خصلت والے چراغ کا غلام ہوں کہ جس سے تیرے چراغ نے روشنی پائی ہے، میں اس دریائے نور کی موج کا غلام ہوں جو ایسے ایسے موتی باہر لاتی ہے۔ لہٰذا مجھے اپنے مذہب کا کلمۂ شہادت سکھا کیونکہ میں نے تجھ کو اپنے سے زیادہ سربلند پایا۔

القصہ اس پہلوان کے قریب جس قدر اس کے رشتے دار اور اہلِ قوم جمع تھے سب نے پروانہ وار دینِ اسلام قبول کیا حضرت نے صرف تیغِ حلم سے اتنی خلقت کو بندۂ حلقہ بگوش بنایا اور ان کے گلوں کو شمشیرِ آب دار سے بچا لیا لہٰذا تیغِ حلم تیغِ فولاد سے زیادہ تیز بلکہ فتح و کامرانی میں سو لشکروں پر فائق ہے۔



دفتر دوم

حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایک شخص کا خیال کو ہلال سمجھ لینا

جب دل کا آئینہ صاف پاک ہو جائے تو اس عالم آب و گل سے بالاتر عالموں کے نقش بھی تو دیکھ سکتا ہے بلکہ تو نقش و نقاش دونوں کو دیکھ سکتا ہے، لیکن اگر آنکھ کے سامنے ایک بال بھی آڑا ہو جائے تو تیرا خیال (قیاس، دُرِشا ہوار کو بھی پوتھ بتلاتا ہے۔ تو پوتھ اور موتی میں اس وقت فرق سمجھ سکتا ہے کہ جب اپنے خیال پر اڑنے سے باز آئے۔ اے دُرِ شاہوار پہچاننے والے! ایک حکایت سن تاکہ تو حقیقت اور خیال کا فرق سمجھ سکے۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں رمضان کا مہینہ آیا تو لوگ چاند دیکھنے کے لیے ایک اونچے پہاڑ پر چڑھ گئے تاکہ رمضان کا چاند دیکھ کر روزے رکھنے شروع کریں۔ ایک شخص نے کہا کہ یا عمر، دیکھو! یہ رہا چاند۔ جب حضرت نے آسمان پر چاند نہ دیکھا تو کہا یہ چاند تیرے خیال سے پیدا ہوا ہے ورنہ میں افلاک کو تجھ سے زیادہ دیکھنے والا ہوں۔ مجھے چاند کیوں نظر نہیں آتا۔ پھر اس سے کہا کہ ہاتھ بھگو کر اپنی بھوں پر پھیر اور پھر آسمان کی طرف دیکھ، کہ پھر بھی تجھے چاند نظر آتا ہے یا نہیں۔ جب اس نے بھوں کو بھگو کر سب بال یکساں کر کے دیکھا تو کہا کہ یا حضرت! اب تو چاند کہیں نہیں۔ وہ تو غائب ہو گیا۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ نہیں تیری بھوں کے بال نے خم کھا کر تجھے وہم میں ڈالا تھا۔ یعنی اس کی بھوں کا ایک بال ٹیڑھا ہو گیا تو اس بال سے نئے چاند کا دھوکا ہونے لگا۔

اب سوچنے کی بات ہے کہ جب ایک بال کے مڑ کر سامنے آجانے سے دیکھنے والے

اور آسمان کے درمیان پردہ ہو جاتا ہے تو جب تیرے سارے اجزائے فطرت ٹیڑھے ہو جائیں تو کس قدر دھوکا ہو سکتا ہے۔ اے سیدھا راستہ تلاش کرنے والے! اپنے اجزا کو سچّوں کے پاس سیدھا کر۔ ترازو ہی ترازو کو درست کرتی ہے اور ترازو ہی ترازو کو غلط کرتی ہے۔ جو گمراہوں کے ساتھ تُلتا ہے خود اس کا وزن بگڑ جاتا ہے اور اس کی عقل کھوئی جاتی ہے +



ایک چور کا دوسرے سنپیرے کا سانپ چُرا لینا

ایک چور نے کسی سنپیرے کا سانپ چُرا لیا اور بے وقوفی سے مالِ موذی نصیبِ غازی سمجھا۔ سانپ زہریلا تھا۔ سنپیرا تو ڈسنے سے محفوظ رہا لیکن چور اسی سانپ سے ڈسا گیا۔ سنپیرے نے جب اسے دیکھ کر پہچانا تو کہا کہ اس نے میرے سانپ کی جان سے زیادہ رکھیا کی۔ میری جان یہ دعا کرتی تھی کہ الٰہی ایسا کر کہ اپنے چور کو پکڑوں اور سانپ چھین لوں۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ دعا منظور نہیں ہوئی اور جو بات میری مرضی کے خلاف تھی وہی فائدہ مند نکلی۔

آدمی بہت سی ایسی دعائیں کرتا ہے جو اگر پوری ہو جائیں تو نقصان و ہلاکت واقع ہو لیکن خدا اپنے کرم سے ایسی دعاؤں پر توجہ نہیں فرماتا۔ دعا کرنے والا خدا سے شکایت اور بدگمانی کرتا ہے حالانکہ اس کی دعا کا نامقبول ہونا ہی بہتر ہوتا ہے۔ وہ نہیں سمجھتا کہ اس نے اپنے لیے آپ ہی مصیبت کی دعا کی تھی اور خدا نے محض اپنے کرم سے اس کو قبول نہ کیا +



ایک ہمراہی کا حضرت عیسےٰؑ سے ہڈیوں کو جِلا دینے پر اصرار کرنا

ایک بے وقوف حضرت عیسےٰؑ کا شریکِ سفر تھا اس نے ایک گہرے گڑھے میں ہڈیاں دیکھ کر کہا کہ اے روح اللہ! وہ کیا نامِ پاک ہے جس سے تو مُردوں کو زندہ کرتا ہے۔ مجھے بھی تو وہ اسمِ پاک

سکھا دے تاکہ ان پُرانی ہڈیوں میں جان ڈال دوں ۔حضرت عیسٰیؑ نے فرمایا، تو چپ رہ یہ کام تیرا نہیں ، تیرا دم اور تیری زبان اس کام کے لائق نہیں ۔ اس نے کہا خیر اگر میں ان اسرار کو زبان پر نہیں لا سکتا تو تو ہی ان ہڈیوں پر کچھ پڑھ کر دم کردے ۔حضرت عیسٰیؑ نے اپنے دل میں کہا کہ الٰہی یہ بھید کیا ہے۔ اس بے وقوف کو اتنا اصرار کیوں ہوگیا ہے۔ اس بیمار کو اپنا غم کیوں نہیں اور اس مُردار کو اپنی جان کی فکر کیوں نہیں۔ اس نے اپنے مردے کو چھوڑ دیا ہے اور بیگانے مُردے جلانے چاہتا ہے۔ خدا نے وحی کی کہ بد اقبالی کو بد اقبالی ہی کی تلاش ہوتی ہے کیونکہ کانٹوں کا اُگنا ان کے بوئے جانے کا بدلہ ہے۔جب حضرت عیسٰیؑ نے دیکھا کہ وہ بے وقوف ہم سفر سوائے بحث و تکرار کے ایک قدم آگے بڑھانا نہیں چاہتا اور اپنی بے عقلی کی وجہ سے کوئی نصیحت قبول نہیں کرتا بلکہ اپنی گمراہی کی وجہ سے (معجزہ نہ دکھانے کو) بخل سمجھتا ہے تو حضرت عیسٰیؑ نے اس کی درخواست کے مطابق ان ہڈیوں پر خدا کا نام دم کیا ۔ خدا کے حکم سے وہ ہڈیاں زندہ ہوگئیں ۔ یکایک دیکھا کہ وہ تو ایک شیر سیاہ تھا اس نے ایک چھلانگ ماری اور پنجہ مار کر اس شریکِ سفر کو پھاڑ ڈالا ۔ اس کا کلّہ توڑ کر بھیجا پاش پاش کر دیا اور اس کا خول ایسا رہ گیا جیسے اس میں کبھی مغز تھا ہی نہیں ۔

حضرت عیسٰیؑ نے شیر سے پوچھا کہ تو نے اس قدر جلد کیوں پھاڑ ڈالا ۔شیر نے جواب دیا کہ اس وجہ سے کہ آپ اس سے ناراض ہوگئے تھے ۔ پھر حضرت عیسٰیؑ نے پوچھا کہ اس کا خون تو نے کیوں نہیں پیا۔شیر نے جواب دیا کہ میری قسمت میں رزق نہیں تھا ۔ اگر مجھے اس جہان میں روزی ہوتی تو مُردوں میں داخل ہونے سے کیا کام تھا۔ یہ سزا اس کی جو آبِ لال گدھے کی طرح پیر مار کر گدلا کر دیتا ہے ۔ اگر نہر کی قدر گدھا جانے تو بجائے پاؤں کے اس میں سر رکھے ۔

ایک صوفی کا اپنا خچر خادمِ خانقاہ کے حوالے کرنا اور خود بے فکر ہو جانا

ایک صوفی سیر و سفر کرتا ہوا کسی خانقاہ میں رات کے وقت اُتر پڑا۔ سواری کا خچر تو اس نے اصطبل میں باندھا اور خود خانقاہ کے اندر مقامِ صدر میں جا بیٹھا۔ اہلِ خانقاہ پر وجد و طرب کی کیفیت طاری ہوئی۔ پھر وہ مہمان کے لیے کھانے کا خوان لائے۔ اس وقت صوفی کو اپنا خچر یاد آیا۔ خادم کو حکم دیا کہ اصطبل میں جا اور خچر کے واسطے گھاس اور جو مہیا کر۔ خادم نے کہا لاحول ولا۔ آپ کے فرمانے کی ضرورت کیا ہے، میں ہمیشہ سے یہی کام کیا کرتا ہوں۔ صوفی نے کہا کہ جَو کو ذرا پانی کا چھینٹا دے کر بھگو دینا کیونکہ وہ خچر بڈھا ہو گیا ہے اور دانت اس کے کمزور ہو گئے ہیں۔ خادم نے کہا، لاحول ولا، اجی حضرت! آپ مجھے کیا سکھاتے ہیں، لوگ ایسی ایسی تدبیریں تو مجھ سے سیکھ کر جاتے ہیں۔ صوفی نے کہا کہ پہلے اس کا پالان اُتارنا اور پھر اس کی پیٹھ کے زخم پر منسل کا مرہم لگا دینا۔ خادم نے کہا لاحول ولا آپ اپنی حکمت تہ کر کے رکھیے۔ میں ایسے سب کام جانتا ہوں۔ سارے مہمان ہماری خانقاہ سے راضی خوشی جاتے ہیں کیونکہ مہمانوں کو ہم اپنی جان اور عزیزوں کے برابر سمجھتے ہیں صوفی نے کہا کہ اس کو پانی پلانا مگر ذرا کنکنا کر کے دینا۔ خادم نے کہا، لاحول ولا، حضرت آپ کی ان چھوٹی چھوٹی باتوں کے جتانے سے تو میں شرمانے لگا۔ پھر صوفی نے کہا کہ بھائی جَو میں ذرا سی گھانس بھی ملا دینا۔ خادم نے کہا کہ لاحول ولا، آپ چپ ہو جائیے سب کچھ ہو جائے گا۔ صوفی نے کہا کہ اس کے تھان کے کنکر پتھر اور کوڑا کرکٹ جھاڑ دینا اور اگر وہاں سیل ہو تو خشک گھانس بچھا دینا۔ خادم نے کہا لاحول ولا، اے بزرگ لاحول پڑھ۔ بھلا ایک قابل کارپرداز سے ایسے اِتنے کے بچّے کرنے سے کیا فائدہ۔ صوفی نے کہا میاں! ذرا کھریرا بھی پھیر دینا اور جاڑوں کی راتیں ہیں ذرا خچر کی پیٹھ پر جھول ڈال دینا۔ خادم نے کہا لاحول ولا، اے بدے بزرگوار! آپ اس قدر اہتمام نہ فرمائیے، میرا کام دودھ کی مانند پاکیزہ

اور شک وشبہ سے پاک ہوتا ہے، آپ اس میں مینگنیوں (یعنی شک وشبہ) کی تلاش نہ کریں۔ میں اپنے فن میں آپ سے زیادہ مشّاق ہوگیا ہوں کیونکہ ہمیشہ نیک و بدمہانوں سے کام پڑتا رہتا ہے۔ ہر مہمان کے لائق خدمت کرتا ہوں۔

خادم نے اتنا کہ کر کمر باندھی اور کہا، لو! میں چلا، سب سے پہلے میں گھانس اور جَو کا بندوبست کروں۔ وہ تو چلا گیا۔ اِدھر صوفی پر خوابِ خرگوش ایسا طاری ہوا کہ اس کو پھر اصطبل یاد ہی نہ آیا۔ خادم اپنے بدمعاش یاروں میں جاکر صوفی کی فرمایشوں کی ہنسی اُڑانے لگا۔ صوفی راستے کا تھکا ہارا لیٹ گیا اور نیم خواب حالت ہی میں خواب دیکھنے لگا۔

ایک خواب اس نے یہ دیکھا کہ اس کے خچر کو ایک بھیڑیا دبوچ کر اس کی پیٹھ اور ران سے گوشت کے لوتھڑے نوچ کر کھا رہا ہے (آنکھ کھُل گئی اپنے جی سے کہا) لاحول ولا، یہ کیا مالیخولیا ہے بھلا وہ مہربان خادم کہاں گیا ہوگا (وہ تو اس کے پاس ہی ہوگا) پھر خواب دیکھا کہ وہ خچر راستہ چلتے میں کبھی کنوئیں میں گر پڑتا ہے اور کبھی گڑھے میں۔ اسی طرح کے خوف زدہ واقعات خواب میں دیکھ کر بار بار چونک پڑتا اور کبھی سورۂ فاتحہ اور کبھی سورۂ القارعہ پڑھ لیتا تھا۔ آخر بے تاب ہوکر کہا کہ اب کیا چارہ ہے سب اہلِ خانقاہ سوتے ہیں اور اور خادم دروازے بند کر کے چلے گئے۔ صوفی تو ان وسوسوں میں گرفتار تھا اور خچر پر وہ مصیبت پڑی کہ خدا ایسی مصیبت دشمنوں ہی پر ڈالے۔ اس خچر بے چارے کا پالان وہاں کی خاک اور پتھروں میں گھستے گھستے کھا کر ٹیڑھا ہوگیا اور باگ ڈور ٹوٹ گئی۔ دن بھر کا تھکا ہارا، رات بھر کا بھوکا پیاسا کبھی نزع کے عالم میں کبھی موت کے عالم میں بسر کرتا رہا۔ زبانِ حال سے کہتا تھا کہ "ای بزرگانِ دین! رحم کرو، میں ایسے کچّے اور بے شعور صوفی سے بیزار ہوگیا"۔ الغرض اس خچر نے رات بھر جو تکلیف و اذیت جھیلی ایسی تھی جیسی کہ خاکی پرندے پر پانی میں پڑتی ہے۔ پس وہ ایک ہی کروٹ صبح تک بھوک سے بے تاب پڑا رہا۔ گھانس اور جَو کے فراق میں ہنہناتے ہنہناتے سویرا ہوگیا۔ جب اُجالا پھیل گیا

تو خادم آیا اور جھٹ پٹ پالان کو سرکا کر اس کی پیٹھ پر رکھا اور سنگ دل گدھے بیچنے والوں کی طرح دو تین زخم لگائے۔ خچّر کیل کے چبھنے سے طرارے بھرنے لگا۔ غریب کے زبان کہاں جو اپنا حال بیان کرتا۔ لیکن جب صوفی سوار ہو کر آگے روانہ ہُوا تو خچّر مارے کمزوری کے گرنے لگا۔ جہاں کہیں گرتا تھا، لوگ اسے اُٹھا دیتے تھے اور جانتے تھے کہ خچّر بیمار ہی۔ کوئی خچّر کے کان مروڑتا اور مُنہ کھول کر دیکھتا، کوئی دیکھتا کہ کہیں سم اور نعل کے بیچ میں کنکر تو نہیں آ گیا اور اس کی آنکھیں چیر کر ڈھیلے کا رنگ دیکھتا اور سب یہ کہتے کہ ای شیخ! خچّر تمھارا بار بار گرا پڑتا ہی اس کا کیا سبب ہی، شیخ جواب دیتا کہ خدا کا شکر ہی خچّر تو قوی ہی مگر وہ خچّر جس نے رات بھر لاحول کھائی سوائے اس طریقے کے راستہ طے نہیں کر سکتا اور یہ حرکت واجبی معلوم ہوتی ہی جب کہ خچّر کی غذا لاحول تھی تو رات بھر اس نے تسبیح کی اب دن بھر سجدے کرے گا۔

جب کسی کو تمھاری حاجات سے دل سوزی نہیں ہی تو اپنا کام آپ ہی کرنا چاہیے اکثر لوگ مردم خوار ہیں ان کی سلام علیک سے فلاح کی امید نہ رکھ۔ جو شخص شیطان کے افسوں سے لاحول کھاتا ہی وہ خچّر کی طرح عین معرکۂ جنگ میں سر کے بل گرتا ہی۔ شیر کی طرح اپنا شکار آپ کر اور کسی اپنے بیگانے کے دھوکے میں نہ آ۔ نا اہلوں کی خدمت گزاری ایسی ہی ہوتی ہی جیسی اس خادم نے کی۔ ایسے نا اہلوں کے فریب میں آنے سے بے نوکر رہنا بہتر ہی ✦



شیخ احمد خضرویہؒ کا قرض خواہوں کے لیے حلوا خریدنا

ایک شیخ ہمیشہ قرض دار رہتا تھا اور اس بارے میں اس کی دلیری مشہور ہو گئی تھی۔ بڑے بڑوں سے ہزاروں روپیہ قرض لیتا اور بلا استثنا فقیروں پر خرچ کرتا تھا۔ اسی قرض سے

اس نے ایک خانقاہ بنوائی اور اپنی جان و مال اور خانقاہ سب کچھ اُڑا ڈالا۔ اس شیخ کا نام احمد خضرویہؒ اور کام اہلِ عشق کی خدمت گزاری تھا۔ خدا اس کو ہر جگہ سے قرض دلوا دیتا تھا گویا خدا نے اپنے پیارے کے لیے ریت[1] کو آٹا بنا دیا تھا۔

قرض دار شیخ نے سالہا سال یوں ہی گزارے، اِدھر لیا اور اُدھر فقیروں کی امداد کے لیے دے دیا۔ جب شیخ کی عمر ختم ہونے کو ہوئی۔ مرضِ موت کے آثار نظر آنے لگے اس وقت قرض خواہ سب آکر گرد جمع ہو گئے اور شیخ شمع کی مانند سہج سہج پگھل رہا تھا۔ قرض خواہوں کا دل اس قدر کھٹا اور مایوس ہو گیا کہ دردِ دل کے ساتھ دردِ شِش بھی ہونے لگا۔ شیخ نے فرمایا کہ ان بدگمانوں کو تو دیکھو! کیا خدا کے پاس چار سو اشرفیاں بھی نہیں!! (اسی اثنا میں) ایک حلوا فروش لڑکے نے آواز لگائی۔ شیخ نے خادم کو حکم دیا کہ جا وہ سب حلوا خرید لے اور جی میں سوچا کہ یہ قرض خواہ حلوا کھائیں گے تو تھوڑی دیر کے لیے ترش روئی ترک کر دیں گے۔ فوراً خادم دروازے کے باہر نکلا اور پوچھا کہ حلوے کا سارا تھال کس قیمت میں دو گے، لڑکے نے کہا کہ نصف دینار اور چند درہم میں۔ خادم نے کہا کہ نہیں نہیں صوفیوں سے زیادہ نہ لو۔ بس نصف دینار میں سب حلوا دے دو۔ اس نے پوری تھال شیخ کے آگے رکھ دی، اب شیخِ دُور بیں کی کرامات دیکھو۔ قرض خواہوں کو اشارہ کیا کہ یہ فقیروں کا تبرک ہے اس کو اطمینان سے کھاؤ۔ حسبِ حکم سب حلقہ باندھ کر بیٹھ گئے اور خوشی خوشی ساری تھال پونچھ کر کھا گئے۔ جب تھال صاف ہوئی تو لڑکے نے اُٹھالی اور شیخ سے قیمت طلب کی۔ شیخ نے کہا میاں بچے قیمت کہاں سے لاؤں، میں بے حد قرض دار ہوں اور اب عالمِ نزع میں ہوں۔ لڑکے نے تھال مارے غصے کے پٹک دی اور رونا دھونا شروع

---

[1] ریت کی تشبیہ قرض سے ہے جو کھانے کے قابل نہیں مگر خدا نے اپنے پیارے کی خاطر اس کو بھی خوش گوار کر دیا تھا۔ مترجم

کردیا۔ روتا تھا اور لمبے لمبے راگ نکال کر بین کرتا اور کہتا تھا کہ کاش میرے دونوں پا نو ٹوٹ جاتے۔ کاش میں کسی کوڑی پر جاتا اور اس خانقاہ کے دروازے پر پھیری نہ کرتا۔ چیخ پکار سُن کر وہاں بہت سے شریف و رذیل لڑکے کے گرد جمع ہوگئے۔ آخر کار وہ لڑکا پھر شیخ کے پاس آیا اور کہا کہ ارے ظالم بڈھے! مجھے تو استاد مار ہی ڈالے گا۔ کیا تجھے منظور ہے کہ میں اس کے آگے خالی ہاتھ جاؤں اور وہ مجھے مار ڈالے۔ قرض خواہوں نے بھی بہت لعنت و ملامت کی اور شیخ سے کہا کہ تم نے یہ کیا چلتر کیا۔ ہمارا مال ہضم کرگئے وہ ظلم کی پوٹلی تو ساتھ لیے جارہے ہو اس کے اوپر طرہ یہ ظلم بھی سر پر اُٹھا لیا۔ نمازِ ظہر کے وقت تک حلوے والا چھوکرا روتا رہا اور شیخ نے آنکھیں بند کرلیں اور اس کی طرف پلٹ کر نہ دیکھا۔

شیخ کا دل جھگڑے فساد سے پاک تھا۔ بدلی کے چاند کی طرح لحاف میں مُنہ لپیٹے پڑے رہے۔ اس لڑکے کے لیے تماشائیوں نے پیسہ پیسہ کرکے حلوے کی قیمت جمع کی تو شیخ کی ہمت نے اسے بھی ناپسند کیا اور اس چندے کو روک دیا اور ممانعت کردی کہ لڑکے کو کوئی کچھ نہ دے۔ صاحبانِ دل کے پاس اس سے بہت زیادہ ہے۔ جب نمازِ ظہر پڑھ چکے تو دیکھتے کیا ہیں کہ ایک خادم خوان سر پر رکھے چلا آتا ہے۔ ایک دولت مند صاحبِ دل نے جو شیخ کا معتقد تھا یہ سوغات بھیجی تھی۔ اس میں چار سو دینار تو ایک طرف رکھے ہوئے تھے اور نصف دینار ایک پُڑیا میں لپٹا ہُوا دوسری طرف تھا۔ خادم نے آکر شیخ کو سلام کیا اور وہ خوان سامنے رکھ دیا۔ جب شیخ نے خوان پوش اُٹھایا تو لوگوں نے شیخ کی کرامت دیکھی۔ سب دیکھنے والوں کی ایک دم چیخ نکل گئی کہ اے بزرگوں کے بزرگ! یہ کیا ماجرا ہے، اے اہلِ باطن کے بادشاہ، ہم آپ کو ایسا نہ جانتے تھے۔ برائے خدا ہم کو معاف کیجیے ہم بہت بیہودہ اور بے جا باتیں کہہ چکے ہیں۔ ہم نے جو اندھے پن کے ساتھ لکڑیاں چلائیں تو ضرور قندیلوں کو توڑ دیا ہوگا۔ ہم بہروں نے اپنے مخاطب کی

ایک بات بھی نہیں سُنی لیکن بدتمیزی سے قیاسی جواب دیتے رہے۔ شیخ نے فرمایا کہ میں نے تمھاری سب بدزبانیوں کو معاف کیا۔ میں نے جو اس قدر تمھیں روکے رکھا اس کا راز یہی تھا کہ میں نے خدا سے ہدایت کی دعا کی اور اس نے میرے واسطے یہ راستہ پیدا کیا۔ اس لڑکے کا ایک دینار اگرچہ مالیت میں کم ہے لیکن اُسی پر اس لڑکے کی بے قراری موقوف تھی اور جب تک طفلِ حلوا فروش نہ روئے سخاوت کا دریا جوش میں نہیں آتا۔

ای بھائی! وہ لڑکا تیری چشمِ گریاں ہے اپنی مقصد براری اپنے ہی رونے پر موقوف ہے تیرا مطلب دل کے رونے سے وابستہ ہے اور جب تک نہ روئے جب تک کامیابی مشکل ہے۔



ایک گنوار کا اندھیرے میں شیر کو کھُجانا

ایک گنوار نے گائے طویلے میں باندھی، شیر آیا اور گائے کو کھا لی وہیں بیٹھ گیا۔ وہ گنوار رات کے اندھیرے میں اپنی گائے کو ٹٹولتا ہوا طویلے پہنچا اور اپنے خیال میں گائے کو بیٹھا پا کر شیر کے ہاتھ پیر پر کبھی پیٹھ اور پہلو پر اور کبھی نیچے کبھی اوپر ہاتھ پھیرنے لگا۔ شیر نے اپنے جی میں کہا کہ اگر ذرا بھی اُجالا ہوتا تو اس کا پتّا پھٹ جاتا اور دل خون ہو جاتا۔ یہ اس قدر گستاخانہ جو مجھے کھُجاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے گائے سمجھ رہا ہے۔

حق بھی یہی کہتا ہے کہ ای فریب خوردہ اندھے تو نہیں جانتا کہ میرے نام سے طور چکنا چور ہو گیا تھا۔ تو نے تقلیدی طور پر اپنے ماں باپ سے خدا کا نام سنا ہے تحقیق کے ساتھ اس سے واقف ہو جائے تو طور کی طرح تو بھی بےنشان و بے جا ہو جائے۔



ایک مُسافر صوفی کے گدھے کو صوفیوں کا بیچ کھانا

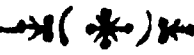
عبرت کے طور پر یہ قصہ سُنو تاکہ تم تقلید کی آفت سے خبردار ہو جاؤ۔ ایک صوفی بحالتِ سفر کسی خانقاہ میں پہنچا اور اپنے گدھے کو اصطبل میں باندھ کر ڈول میں پانی بھر کر پلایا اور گھانس اپنے ہاتھ سے ڈالی۔ یہ صوفی ویسا غافل صوفی نہ تھا جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ اس نے اپنی طرف سے گدھے کی دیکھ بھال میں کچھ کمی نہیں کی لیکن جب امر شدنی ہو تو احتیاط سے کیا ہوتا ہے۔ اس خانقاہ کے صوفی سب مفلس قلاش تھے اور جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے بعض دفعہ محتاجی کفر تک پہنچا دیتی ہے۔ اے تونگر تو پیٹ بھرا ہے، کسی دردمند فقیر کی کج روی کا مذاق نہ اُڑا۔

غرض وہ گروہِ صوفیا گدھے کو بیچ ڈالنے کے درپے ہوا اور تاویل اپنے گناہ کی یہ کی کہ ضرورت پر مُردار بھی حلال ہو جاتا ہے پھر سب نے مل کر وہ گدھا بیچ دیا اور مزے مزے کے کھانے لائے اور خوب روشنی کی۔ ساری خانقاہ میں دھوم مچ گئی کہ آج رات کو کھانا بھی ہے اور سماع بھی۔ آخر یہ تکلیف اور تین دن کا روزہ کب تک اور کب تک جھولیاں لے کر بھیک مانگتے پھریں۔ آخر ہم بھی تو خدا کے بندے ہیں، ہم بھی جان رکھتے ہیں، اس لیے جو ہو سو ہو آج تو ہم بھی دولت کی مہمان داری کریں گے۔ وہ مسافر صوفی اصل حال سے بے خبر یہ راگ رنگ دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں خانقاہ والے سب اس کی طرف جُھک پڑے کوئی ہاتھ پاؤں دباتا اور کوئی پوچھتا کہ حضرت کہاں تشریف رکھیں گے۔ کوئی بستر کی گرد جھٹکتا اور کوئی ہاتھ اور منہ کا بوسہ لیتا۔

مسافر صوفی نے اپنے جی میں کہا جب کہ ان صوفیوں کا میلان میری طرف اس درجہ ہے تو میں بھی کیوں نہ عیش میں شرکت کروں۔ القصہ جب سب نے عمدہ عمدہ کھانے کھالیے تو سماع شروع ہوا، ساری خانقاہ فرش سے لے کر چھت تک گرد اور دھوئیں سے اندھیری

ہوگئی۔ دھنواں تو باورچی خانے کا تھا اور گرد حالتِ وجد میں پاؤں زمین پر مارنے سے پیدا ہوگئی تھی۔ کبھی تالیاں بجاتے اور دھپ دھپ ٹھوکریں لگاتے اور کبھی مارے سجدوں کے صد دالان کی جھاڑ و دیتے۔ جب سماع انتہا کو پہنچا تو قوال نے ایک آستائی بلند سروں میں چھیڑ دی اور "گدھا رخصت ہوا، گدھا رخصت ہوا" کی ٹیپ ایسی الاپنی شروع کی کہ اہلِ سماع میں حرارت کی رَو دوڑ گئی اور وہ صوفی مسافر بھی اسی جوش و خروش میں صبح تک پاؤں پیٹتا اور سب گانے والوں کے ساتھ "گدھا رخصت ہوا، گدھا رخصت ہوا" گاتا رہا۔ جب سماع اختتام کو پہنچا اور جوش و سرمستی کم ہوئی تو دیکھا کہ صبح ہوگئی۔ الوداع کہہ کر رخصت ہوئے۔ ساری خانقاہ خالی ہوگئی صرف مسافر صوفی تنہا رہ گیا تو اس نے اپنے بستر کو جھٹک جھٹکا کر باندھا اور حجرے سے باہر نکالا تاکہ جھٹ پٹ گدھے پر لاد کر ہمراہیوں کے ساتھ روانہ ہو جائے۔ مگر اصطبل میں دیکھا تو گدھا ندارد۔ اپنے جی میں کہا کہ غالباً خانقاہ کا خادم پانی پلانے لے گیا ہوگا کیونکہ کل اس نے پانی بہت کم پیا تھا۔ جب خادم آیا تو صوفی نے پوچھا کہ گدھا کہاں ہے۔ خادم نے کہا، ہائیں ذرا آپ کی ڈاڑھی، تو دیکھو، بس پھر کیا تھا، لڑائی شروع ہوگئی۔ صوفی نے کہا کہ میں نے تو گدھا تیرے سپرد کیا تھا اور تجھ ہی کو گدھے پر نگران کیا تھا۔ میں تجھی سے لین دار ہوں اور تجھ ہی کو دینا پڑے گا۔ ورنہ اگر تو زیادہ حجت کرتا ہے تو چل قاضی کے پاس تصفیہ ہو جائے گا۔ اب خادم دبا اور گڑگڑا کر کہنے لگا کہ میں بالکل مجبور تھا۔ سب صوفیوں نے مشورہ کر کے ایک دم حملہ کیا اور مجھے ادھ موا کر دیا۔ بھلا ذرا غور تو کر کہ تو کلیجی بلیوں کے بیچ میں ڈال دے اور پھر اس کے محفوظ رہنے کی امید کرے۔ صوفی نے کہا مانا تجھ سے انھوں نے زبردستی گدھا چھین لیا اور مجھ مسکین کی جان پر مصیبت نازل کی لیکن کیا تجھ سے یہ بھی نہ ہو سکتا تھا کہ میرے پاس فریاد کرتا اور کہتا کہ ای بے نوا تیرے گدھے کو لے جا رہے ہیں۔ جب تک وہ لوگ یہاں موجود تھے اس وقت تک تو سو طرح کے جتن ممکن تھے لیکن اب تو وہ سب چل دیے۔ اب میں

کسے پکڑوں کسے قاضی کے پاس لے جاؤں ؟ خادم نے کہا کہ واللہ میں کئی بار آیا تاکہ تجھے ان کی کارستانیوں سے واقف کروں مگر تو تو خود ہی بڑے ذوق و شوق میں سب کے ساتھ "گدھا رخصت ہُوا ، گدھا رخصت ہُوا" کہہ رہا تھا ۔ جب خود تیری زبان سے میں نے سنا تو اس قیاس پر کہ تو قانع درویش ہے اور گدھے کے جانے پر راضی ہے میں واپس چلا گیا ۔ صوفی نے کہا کہ اس جُملے کو سب خوش آوازی سے ادا کر رہے تھے تو مجھے بھی اس کے بولنے میں مزا آنے لگا ۔ ہائے مجھے ان کی تقلید نے برباد کر دیا ایسی تقلید پر سو بار لعنت ۔ خاص کر ان بے حاصلوں کی تقلید جنھوں نے روٹی کے لیے اپنی عزت گنوائی ۔



مفلس اور کھاؤ قیدی کی منادی

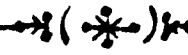
ایک مفلس بے گھر شخص قید میں ڈالا گیا تھا ۔ وہ ایسا بڑ پیٹا تھا کہ سارے قیدیوں کا کھانا کھا جاتا تھا ۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ پیٹ بھر کر روٹی کھا سکے کیونکہ ہاتھ چالاک بہت جلد اُڑا لیتا تھا ۔ قاضی کا وکیل جو پوچھ گچھ کے لیے آیا تو اہلِ زنداں نے شکایت کی کہ ہمارا سلام قاضی کو پہنچا کر اس کمینے آدمی کی ایذا رسانی کا حال کہنا اس نے ہاتھ چالاکی ، پُرخواری اور ایذا رسانی میں بڑا نام نکالا ہے ۔ کوئی قیدی ایک لقمہ بھی نہیں کھا سکتا چاہے کھانے کے لیے سو حیلے کرے فوراً ہی وہ بڑ پیٹا آن موجود ہوتا ہے اور دلیل اس کی یہ ہوتی ہے کہ خدا نے "کُلُوا" یعنی "کھاؤ" کا حکم دیا ہے ۔ کم بخت ہر کھانے پر مکھی کی طرح بھنبھناتا ہوا بن بُلائے آ پہنچتا ہے ۔ اس کے آگے ساٹھ آدمیوں کا کھانا بھی کوئی چیز نہیں اگر اس سے بس کہو تو بہرا بن جاتا ہے ۔ خدا کرے کہ مولانا کا سایہ تا ابد قائم رہے ۔ یا تو زندان سے اس بھینسے کو نکالیے یا مدِ وقف سے اس کی خوراک مقرر کیجیے ۔ سرکار آپ کے انصاف سے سب مرد و زن خوش ہیں ہماری داد کو بھی پہنچیے ۔ بامروّت وکیل نے قاضی کے پاس حاضر ہو کر سب شکایتیں الگ الگ بیان

کردیں۔ قاضی نے اس کو قید خانے سے اپنی پیشی میں بلوایا اور اپنے ماتحت عہدہ داروں کے ذریعے سے بھی تحقیقات کی۔ قیدیوں کی شکایت صحیح ثابت ہوئی۔ قاضی نے اس مفلس قیدی سے کہا کہ اس قید خانے سے دفع ہو اور اپنے ہی گھر میں جا کر مرو۔ اس نے کہا میرا گھر بار تو آپ ہی کا احسان ہے اور کافر کی طرح میری جنت تو آپ ہی کا قید خانہ ہے۔ اگر تو مجھے مردود قرار دے کر قید خانے سے بھی نکالتا ہے تو میں بھوک پیاس اور افلاس سے مر ہی جاؤں گا قاضی نے حکم دیا کہ شہر میں اس کو گشت کراؤ اور عام اعلان کرو کہ یہ بالکل مفلس بے غیرت ہے کوئی شخص بھولے سے بھی اس کو قرض نہ دے۔ اگر آیندہ کوئی اس کے خلاف دعویٰ کرے گا تو بعد ثبوت بھی میں اسے قید میں نہ ڈالوں گا۔ اس کا افلاس ثابت ہو چکا ہے اور کسی قسم کا نقد و جنس اس کے پاس نہیں ہے۔ تب قاضی کے پیادے ایک لکڑ ہارے کُرد کا اونٹ پکڑ لائے۔ اس کُرد بے چارے نے بہتیری واویلا مچائی اور سپاہی کی مٹھی بھی ایک اکنی[1] سے گرم کی مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ اونٹ کی پیٹھ پر وہ بڑ پیٹا بیٹھا ہوا تھا اور اونٹ کا مالک پیچھے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ اس طرح محلے محلے اور کوچہ کوچہ پھراتے رہے یہاں تک کہ سب اہلِ شہر کو علم و شناخت ہو گئی۔ ہر حمام اور ہر بازار کے لوگوں نے اس کی شکل کو پہچان لیا۔ ان منادی کرنے والوں میں تُرک، کُرد، رومی اور تازی تھے۔ سب بلند آواز سے کہتے جاتے تھے کہ یہ شخص بے سر و سامان، بداطوار، روٹیوں کا چور اور سخت بے حیا ہے۔ یہ بالکل مفلس ہے اس کے پاس کچھ نہیں، کوئی اس کو ایک چھدام بھی قرض نہ دے۔ اس کا ظاہر و باطن بالکل خالی ہے، یہ بالکل مفلس، کھوٹا، دغاباز، اور ڈھول ہی ڈھول ہے۔ اس طرح دن بھر تشہیر کے بعد جب رات کو وہ اونٹ سے نیچے اُترا تو کُرد نے کہا کہ میرا مقام یہاں سے بہت دور ہے پہنچنے میں بہت دیر

---

[1] دانگ = اکنی

لگے گی۔ تو صبح سے میرے اونٹ پر بیٹھا رہا اور گھاس کھودنے کی محنت سے زیادہ تھکن مجھ پر سوار ہے۔ مفلس نے جواب دیا کہ تو کچھ سمجھا بھی کہ ہم کیوں پھرائے گئے اور آج تمام دن کیا ہوا، تیرے ہوش کدھر ہیں، کیا دماغ میں شئی لطیف نہیں؟ تو صریحاً سُن چکا کہ فلک ہفتم تک میرے افلاس کی تشہیر کی گئی مگر معلوم ہوتا ہے کہ مارے حرص کے تو کچھ سُن نہ سکا کیونکہ طمع آدمی کے کانوں کو بہرا کر دیتی ہے۔ ڈھیلوں اور پتھروں تک نے سُن لیا کہ یہ مرد بے حمیت مفلس ہے۔ صبح سے رات تک لوگ تشہیر کرتے رہے لیکن اونٹ کا مالک چونکہ حرص میں مبتلا تھا وہ پھر بھی یہ سمجھتا رہا کہ اس مفلوک الحال سے شاید کچھ کرایہ مل جائے گا۔

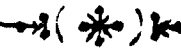


ایک شخص کا بربنائے بدنامی ماں کو مار ڈالنا

ایک شخص نے غیرت میں آکر اپنی ماں کو گھونسوں اور خنجروں سے مار ڈالا۔ کسی نے کہا ارے کم بخت تو نے اپنی ماں کو مار ڈالا اور حقِ مادری کو بھول گیا۔ ہائے ہائے، ارے بدنصیب! بھلا کسی نے بھی ماں کو مارا ہے۔ کیوں نہیں کہتا۔ آخر کیا واقعہ تھا اور اس نے کیا کیا تھا۔ اس نے کہا کہ اس نے وہ کیا کہ اس میں اس کی ذلت تھی میں نے اس کو اس لیے مار ڈالا کہ خاک اس کی عیب پوشی کرے گی۔ وہ ایک شخص سے متہم ہو گئی تھی اس لیے میں نے مار ڈالا اور خون میں لتھڑی ہوئی کو قبر کی خاک میں چھپا دیا۔ معترض نے کہا، ایسا غیرت مند تھا تو اس بدکار مرد کو کیوں قتل نہیں کیا؟ جواب دیا کہ پھر تو ہر روز ایک مرد کو قتل کرنا پڑے گا بس اس کو کیا مارا میں روز روز کے خون سے بچ گیا۔ اس کا گلا کاٹنا مخلوق کے گلے کاٹنے سے بہتر ہے۔

اے عزیز تیرا نفس وہ مادرِ بدخاصیت ہے کہ اس کا فساد ہر طرف پھیلا ہوا ہے۔ پس اس کو قتل کر کہ اسی ذلیل کُتّے کے لیے تو ہر آن کسی نہ کسی سے لڑائی جھگڑے کا قصد کرتا

ہے۔ اسی کی وجہ سے سرسبز دنیا تجھ پر تنگ ہے اور خدا و خلق سے تیری ناموافقت ہے۔ اگر تو اپنے نفس کو مار ڈالے تو گناہوں اور برائیوں سے بچ جائے گا اور ملکِ خدا میں پھر تیرا کوئی دشمن باقی نہ رہے گا۔



ایک بادشاہ کا دو نوخرید غلاموں کا امتحان لینا

ایک بادشاہ نے دو غلام سستے خریدے ایک سے بات چیت کرکے اس کو عقل مند اور شیریں زبان پایا اور جو لب ہی شکر ہوں تو سوائے شربت کے ان سے کیا نکلے گا۔ آدمی کی آدمیت اپنی زبان میں مخفی ہے اور یہی زبان دربار جان کا سراپردہ ہے۔ جب اس غلام کی فراست کا امتحان لے چکا تو دوسرے کو پاس بلایا۔ بادشاہ نے دیکھا کہ اس کے کالے کالے دانت ہیں اور گندہ دہن ہے اگرچہ بادشاہ اس کے بشرے کو دیکھ کر ناخوش ہوا تھا لیکن اس کی قابلیت و اوصاف کی ٹٹول کرنے لگا۔ پہلے کو تو اس نے کام میں لگا دیا کہ جا اور نہا دھو کے آ۔ اور اس دوسرے سے کہا کہ تو اپنی زیر کی بتا۔ تو ایک نہیں سو غلاموں کے مساوی ہے۔ تو ویسا نہیں معلوم ہوتا جیسا کہ تیرے ساتھی نے کہا اور ہمارا دل تجھ سے سرد کر دیا۔ اس نے تو تجھے چوٹا، بدمعاش، ہیجڑا، نامرد اور جانے کیا کیا کہا۔ غلام نے جواب دیا کہ وہ ہمیشہ سچا پایا گیا ہے اس سے زیادہ سچا میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ اس کی فطرت میں راست گوئی داخل ہے اس لیے اس نے جو کچھ میرے متعلق کہا ہے اگر ایسا ہی میں اس کے متعلق کہوں تو تہمت ہوگی۔ میں اس بھلے آدمی کی عیب جوئی نہ کروں گا۔ بجائے اس کے بہتر ہے کہ اپنے ہی کو متہم رکھوں۔ اے بادشاہ ممکن ہے کہ وہ مجھ میں جو عیب دیکھتا ہے شاید میں خود اپنے میں نہ دیکھتا ہوں۔ بادشاہ نے کہا تو بھی اس کے عیب جیسے کہ اُس نے تیرے عیب بیان کیے بے کم و کاست بیان کر تاکہ مجھے یقین ہو کہ تو میرا غم خوار ہے اور میری سلطنت و حکمرانی

کا مددگار رہ سکتا ہے۔ غلام نے کہا کہ اے بادشاہ اس میں مہر و وفا اور مروت و صداقت ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں جواں مردی و سخاوت ایسی کہ وقت پڑے جان بھی دے ڈالے۔ چوتھا عیب یہ کہ وہ خود بیں نہیں بلکہ خود ہی اپنا عیب جو ہے عیب کہنا اور عیب تلاش کرنا اگرچہ بُرا ہے لیکن وہ سب کے ساتھ نیک اور اپنے ساتھ بُرا ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ اپنے ہمراہی کی مدح میں مبالغہ نہ کر اور دوسرے کی مدح کے ضمن میں اپنی مدح پیش نہ کر کیونکہ اگر میں آزمایش کے لیے اس کو تیرے مقابل کر دوں تو تجھ کو شرمساری حاصل ہوگی۔

غلام نے کہا، نہیں! واللہ میرے ساتھی اور دوست کے اوصاف میرے کہے سے سو گنا زیادہ ہیں۔ جو کچھ میں اپنے دوست کے متعلق جانتا ہوں جب مجھے یاد نہیں آتا تو میں کیا عرض کروں۔

اس طرح بہت سی باتیں کر کے بادشاہ نے اُس بد صورت غلام کو آزما لیا اور جب وہ پہلا غلام حمام سے آیا تو اس کو پاس بلایا۔ بد صورت غلام کو وہاں سے رخصت کر دیا اور خوب صورت کی شکل و سیرت کی تعریف کر کے کہا کہ معلوم نہیں تیرے ساتھی کو کیا ہو گیا تھا کہ اس نے پیٹھ پیچھے تیری نسبت بہت کچھ باتیں کہیں۔

غلام نے کہا کہ جہاں پناہ! اس بے دین نے میرے حق میں جو کچھ کہا اُس کا ذرا سا اشارہ تو دیجیے۔ بادشاہ نے کہا کہ سب سے پہلے تیری دو روئی کا وصف اس نے کیا کہ تو ظاہر میں دوا اور باطن میں درد ہے۔ جب اس نے بادشاہ سے یہ سُنا تو ایک دم غصہ دریا کی طرح چڑھ آیا۔ اس کا چہرہ مارے غصّے کے تمتانے لگا اور پھر اس نے اپنے ساتھی کی نسبت جو کچھ منہ میں آیا، کہہ ڈالا۔ جب بار بار ہجو کرتا ہی چلا گیا تو شہنشاہ نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا کہ بس اب حد ہو گئی۔ بادشاہ نے کہا کہ لے سُن! میں نے تجھ میں اور اس میں پوری پوری پہچان کر لی، تیری جان بدبو ہے اور اس کا دہان بدبو ہے۔ پس اے سڑاندھی جان والے تو دُور بیٹھ تاکہ

وہ امیر اور تو اس کا ماتحت رہے۔

اسی لیے دنیا کے بزرگوں نے کہا ہے کہ "زبان کی حفاظت انسان کی راحت ہے"۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ ظاہرداری کی تسبیح (جپ) کو کوڑی کے اوپر سبزہ جانو یقین کرو کہ اچھی اور بھادنی صورت بُری خصلتوں کے ساتھ ہرگز قابلِ قدر نہیں۔ اور چاہے صورت حقیر اور ناپسندیدہ ہو لیکن جب اخلاق اچھے ہوں تو اس کے قدموں مرجانا بہتر ہے۔

لہٰذا اے شخص! تو کب تک آب خورے کے ظاہری نقش و نگار پر فریفتہ رہے گا، نقش و نگار کو چھوڑ اور پانی کو دیکھ کہ وہ کیسا ہے۔ آخر کہہ تو سہی تو کب تک صورت پرستی کرے گا معنی کا طلبگار ہو اور معنی کو ڈھونڈ ۔



ایک پیاسے کا دیوار کی اینٹ توڑ کر ندی میں پھینکنا

ایک ندی کے کنارے بلند دیوار تھی اس پر ایک پیاسا بیٹھا تھا، اور پیاسا بھی مرضِ استقا (تونس) کا بیمار، برے حال بُرے احوال، پانی پر دموں دیوانہ، نہایت پریشان اور بےاوسان۔ وہ دیوار پانی تک پہنچنے میں حائل تھی اور وہ مارے پیاس کے بے قرار تھا۔ اس نے دیوار کی ایک اینٹ اُکھاڑ کر پانی میں جو پھینکی تو پانی کی آواز کان میں آئی وہ آواز بھی اسے ایسی میٹھی اور سریلی لگی جیسے معشوق کی آواز ہوتی ہے۔ اسی ایک آواز نے شراب کی سی مستی پیدا کر دی۔ اس مصیبت زدہ کو پانی کی آواز میں اس قدر مزا آیا کہ دیوار سے اینٹیں اُکھیڑ اُکھیڑ کر پانی میں پھینکنے لگا۔ پانی تو زبانِ حال سے یہ کہہ رہا تھا کہ ارے بھلے مانس! بھلا مجھے اینٹیں مارنے سے تجھے کیا فائدہ؟ پیاسا بھی زبانِ حال سے اس کا جواب دے رہا تھا کہ میرے اس میں دو فائدے ہیں اس لیے میں اس کام سے ہرگز ہاتھ نہ روکوں گا۔ پہلا

فائدہ تو پانی کی آواز کا سننا ہی کہ پیاسوں کے لیے رباب کی آواز سے زیادہ ہی۔ دوسرا فائدہ یہ ہی کہ جتنی اینٹیں میں اس کی اکھیڑتا جاتا ہوں اتنا ہی صاف شفاف پانی کے قریب ہوتا جاتا ہوں کیونکہ اس اونچی دیوار پر سے جس قدر اینٹیں اُکھڑتی جائیں گی اسی قدر دیوار نیچی ہوتی چلی جائے گی۔ لہٰذا دیوار کی پستی موجبِ قرب اور اس کے فصل ہی سے وصل کی تدبیر ہوتی ہی۔

سجدہ کیا ہی، اینٹوں کی چنائی کا اُکھیڑنا ہی جو بہ دلیل آیہ کریمہ واسجد واقترب موجب قربت ہی۔ جب تک اس دیوار کی گردن بلند ہی سر کو جھکانے نہیں دیتی۔ لہٰذا تا وقتیکہ تو اس تنِ خاکی سے نجات نہ حاصل کرے آبِ حیات (یعنی زندگی دوام) کے آگے سجدہ نہیں کرسکتا۔

اے فرزند! اس جوانی کو غنیمت جان، سر جھکا اور (اپنی دیوار کے) ڈھیلوں اور اینٹوں کو اُکھیڑ قبل اس کے کہ بڑھاپے کے دن آجائیں اور تیری گردن بٹی ہوئی رسّی میں بندھ جائے اور بُری عادتوں کی جڑیں ایسی مضبوط ہوجائیں کہ ان کے اُکھیڑنے کی طاقت ہی نہ رہے +

ایک شخص کا سرِ راہ کانٹوں کی جھاڑی کو اُگنے دینا

ایک مُنہ کے میٹھے دل کے کھوٹے شخص نے بیچ راستے میں کانٹوں کی جھاڑی اُگنے دی۔ جو راہ گیر اُدھر سے نکلتا وہ لعنت ملامت کرتا اور کہتا کہ اس کو اُکھیڑ دے لیکن اُس کو نہ اُکھیڑنا تھا نہ اُکھیڑا۔ اس جھاڑی کہ حالت تھی کہ ہر آن بڑھتی جاتی تھی اور خلقت کے پانو کانٹے چبھ کر خونم خون ہوجاتے تھے۔ جب حاکم وقت تک یہ واقعہ پہنچا اور اس کی ناشائستہ حرکت کا علم ہوا تو تاکید سے حکم دیا کہ جھاڑی کو اُکھیڑ دے

اس پر بھی وہ سُستی سے باز نہ آیا اور جواب دے دیا کہ بہت اچھا کسی فرصت کے دن اُکھیڑ ڈالوں گا۔ اس طرح ہر روز کل پر ٹالتا رہا یہاں تک کہ اس کی جھاڑی نے خوب مضبوط جڑ پکڑ لی۔ ایک دن اس سے حاکم نے کہا کہ اے وعدہ خلاف! ہمارے حکم کی تعمیل کر، بس اب ایڑیاں مت رگڑ۔ تو جو روز کل کہتا ہے تو یہ جان لے کہ جس قدر زیادہ مدّت گزرے گی اُسی قدر برائی کا درخت زیادہ تر و تازہ ہوگا اور اُکھیڑنے والا بوڑھا اور کم زور ہوتا جائے گا۔ درخت مضبوط اور تو بوڑھا ہوا جاتا ہے لہٰذا جلدی کر اور موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دے۔

اے عزیز تیری ہر بُری عادت کانٹوں کی جھاڑی ہے بارہا تو اپنے فعل پر شرمندہ ہو کر توبہ تِلّا کر چکا ہے۔ بارہا اپنی عادتوں سے تنگ آچکا ہے پھر بھی تیری آنکھیں نہیں کُھلتیں دوسروں کی تکلیف جو تیرے ہی بُرے اوصاف کی وجہ سے ہے اگر اس کی پروا نہیں تو خیر جانے دے کیا تجھے اپنا زخم بھی محسوس نہیں ہوتا؟ *



ذوالنّون مصری کا اپنے کو دیوانہ بنانا اور دوستوں کا بیمار پُرسی کو آنا

ذوالنّون مصری پر واقعہ یہ گزرا کہ وہ جذبے میں آکر مجنون ہوگئے۔ عوام اس جذبے کی تاب نہ لائے اور ان کو قید خانے میں جکڑ بند کر دیا۔ چونکہ حکومت غنڈوں کے ہاتھ میں تھی اس لیے لامحالہ ذوالنّون کو قید خانہ بھگتنا پڑا۔ قاعدہ ہی یہ ہے کہ جب اقتدار کا قلم غدّار کے ہاتھ میں ہوتا ہے تو منصور جیسا ولی سولی پر چڑھتا ہے۔ نادانوں کے ہاتھ بادشاہت و قضارت آتی ہے تو وہ نبیوں کو قتل کرا دیتے ہیں۔

غرض ذوالنّون پاؤں میں بیڑیاں، ہاتھ میں ہتکڑیاں پہنے قید خانے پہنچے۔ معتقد احباب چاروں طرف سے قید خانے میں مزاج پرسی کے لیے ان کے پاس جمع ہوئے اور ان کے

جنون کے واقعات اور قید خانے کے برتاؤ پر یہ رائے زنی کرنے لگے کہ غالباً یہ قصداً دیوانے بنے ہیں یا ممکن ہے کہ اس میں بھی کوئی حکمت ہو کیونکہ وہ طریقِ عشق میں سب عاشقوں کے قبلہ اور خدا کی نشانی ہیں۔ مگر ایسی عقل سے خدا کی پناہ جو اُن کے عشق و عرفاں کو دیوانگی سمجھتی ہو۔ اسی قسم کی باتیں کرتے ہوئے حضرت کے قریب پہنچے تو آپ نے وہیں سے آواز دی کہ کون لوگ ہو، خبردار آگے نہ بڑھنا۔ ان لوگوں نے ادب سے عرض کیا کہ ہم سب آپ کے معتقد ہیں اور آپ کی مزاج پُرسی کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔ اے صاحب کمال عقل کے دریا! آپ کا کیا حال ہے اور آپ کی عقل پر یہ جنون کا بہتان کیسے لگ گیا۔ ہم سے پوشیدہ نہ رکھیے اور اس واقعہ کو کھول کر بیان فرمائیے۔ ہم سب آپ کے بہی خواہ ہیں۔ اپنے راز کو دوستوں سے پوشیدہ نہ رکھیے بلکہ صاف صاف بیان کیجیے اور اپنی جان کا تصد نہ کیجیے۔ جب ذوالنون نے یہ باتیں سُنیں تو سوائے آزمانے کے چھٹکارا نہ دیکھا۔ فحش اور کچی کچی گالیاں دینی شروع کیں اور دیوانوں کی طرح لام کاف بکنے لگے۔ فوراً لپک کر پتھر، لکڑی جو ہاتھ لگی پھینک پھینک کر مارنے لگے۔ یہ حال دیکھ کر سب لوگ چوٹ کے ڈر سے بھاگ نکلے۔ ذوالنون نے ایک قہقہہ لگا کر سر ہلایا اور ایک درویش سے کہا ذرا دیکھنا ان معتقدوں کو۔ یہ دوست کہاں کے، دوستوں کو تو اپنے دوست کی تکلیف جان کے برابر عزیز ہوتی ہے اور دوست سے جو تکلیف پہنچے وہ گراں نہیں ہوتی بلکہ تکلیف مغز اور دوستی اس کا پوست ہے۔

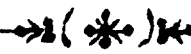
آزمائش و مصیبت اور آزار پر خوش ہونا دوستی کی علامت ہے۔ دوست کی مثال سونے کی سی ہے اور آزمائش آگ کی مثل ہے۔ خالص سونا آگ ہی میں خوش رنگ اور بے کھوٹ رہتا ہے۔

——»)(✻)(«——

خواجہ لقمان کی آزمائش

حضرت لقمان اگرچہ غلام اور غلام زادے تھے لیکن باخدا اور حرص و ہوا سے پاک تھے۔ اُن کا آقا بھی ظاہر میں تو مالک تھا لیکن دراصل ان کے مرتبے سے واقف اور دل سے ان کا غلام ہوگیا تھا۔ وہ ان کو کبھی کا آزاد کر دیتا لیکن لقمان اپنا بھید چھپائے رکھنا چاہتے تھے اور آقا اُن کے خلاف مرضی کوئی کام کرنا نہ چاہتا تھا۔ اُسے تو حضرت لقمان سے یہاں تک محبت و عقیدت ہوگئی تھی کہ جو کھانا ملازمین اس کے واسطے حاضر کرتے تو وہ ساتھ ہی لقمان کے پاس آدمی روانہ کرتا تاکہ پہلے وہ کھالیں اور اُن کا اُلش وہ کھائے۔ وہ لقمان کا جھوٹا کھاتا اور خوش ہوتا تھا اور جو کھانا وہ نہ کھاتے اُسے پھینک دیتا تھا، اور اگر کھاتا بھی تو بالکل بے دل اور بے بھوک کھاتا۔ یہاں تک نوبت پہنچ گئی تھی۔ ایک دفعہ کا اتفاق یہ کہ خربوزہ تحفے میں آیا اور لقمان اس وقت حاضر نہ تھے، مالک نے ایک غلام سے کہا جلدی جاؤ اور میرے فرزند حضرت لقمان کو تو بلا لاؤ۔ جب لقمان آئے اور سامنے بیٹھے تو مالک نے چھری لی اور خود خربوزہ کاٹا اور ایک قاش لقمان کو دی۔ اُنھوں نے ایسے شوق و رغبت سے کھائی کہ مالک نے دوسری قاش دی یہاں تک کہ سترھویں قاش تک وہ اسی طرح ذوق شوق سے کھاتے رہے۔ جب صرف ایک قاش باقی رہی تو مالک نے کہا کہ اس کو میں کھاؤں گا تاکہ معلوم ہو کہ یہ کتنا میٹھا خربوزہ ہے۔ اس نے تو ایسا مزے لے کر کھایا ہے کہ دوسروں کے منہ میں پانی بھر آیا اور کھانے کو جی چاہا۔ جب مالک نے کھایا تو خربوزے کی کڑواہٹ نے حلق میں مرچیں سی لگا دیں اور زبان میں آبلے پڑ گئے۔ گھنٹہ بھر تک اس کی کڑواہٹ سے بدمزہ رہا۔ پھر حیرت سے پوچھا کہ ای عزیز! تو نے اس زہر کو کیوں کر نوش کیا اور اس قہر کو مہر کیوں سمجھ لیا۔ یہ بھی کوئی صبر ہے اور یہ صبوری کس سبب سے ہے۔ شاید تو

اپنی جان کا دشمن ہی۔ تو نے کھانے سے بچنے کا حیلہ کیوں نہیں کیا۔ یہ ہی کہہ دیا ہوتا مجھے اس کے کھانے میں عذر ہی، ذرا توقف کیجیے۔ حضرت لقمان نے کہا کہ میں نے تمھارے نعمت بخشنے والے ہاتھ سے اس قدر کھایا ہی کہ مارے شرم کے دُہرا ہوا جاتا ہوں۔ اس لیے ای صاحبِ معرفت مجھے شرم آئی کہ ایک تلخ چیز تمھارے ہاتھ سے نہ کھاؤں۔ میرے تمام اعضا و جوارح تمھاری ہی عطا سے پلے ہیں اور تمھارے ہی دانہ و دام میں اسیر ہیں۔ اگر میں صرف ایک کڑوے پن پر واویلا مچانے لگوں تو خدا کرے سو راستوں کی خاک میرے اعضا و جوارح پر پڑے۔ تمھارے شکر بخشنے والے ہاتھ نے اس خربوزے میں کڑواہٹ کہاں چھوڑی تھی کہ میں اس کی شکایت کرتا۔



چرواہے کی مُناجات پر مُوسیٰؑ کا انکار

ایک دن حضرت موسیٰؑ نے رستہ چلتے ایک چرواہے کو سُنا کہ وہ کہہ رہا تھا کہ ای پیارے خدا! تو کہاں ہی، آ میں تیری خدمت کروں، تیرے موزے سیوں اور سر میں کنگھی کروں، تو کہاں ہی کہ میں تیری ٹہل خدمت بجالاؤں، تیرے کپڑے سیوں، پیوند پارہ کروں، تیرا جڑاول[1] دھوؤں، جوئیں چُنوں اور ای پیارے تیرے آگے دودھ رکھوں۔ اگر تو بیمار ہو تو میں رشتہ داروں سے بڑھ کر تیمارداری کروں، تیرے ہاتھ چوموں پیروں کی مالش کروں اور جب سونے کا وقت آئے تو تیری خوابگہ کو جھاڑ کر صاف کروں اگر تیرا گھر دیکھ لوں تو بلاناغہ صبح و شام گھی اور دودھ تجھے پہنچاؤں اور پنیر، روغنی

---

[1] جڑاول = پہننے کا لباس

روٹیاں اور پینے کو مزے دار دہی چھانچھ یہ سب چیزیں تیار کر کے صبح و شام لاتا رہوں۔ غرض میرا کام لانا ہو اور تیرا کام کھانا۔ میرے سارے بچے تجھ پر فدا ہوں تیری یاد میں میری بے قراری حد سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔

وہ چرواہا اس طرح بے سروپا باتیں کر رہا تھا، موسیٰؑ نے پوچھا کہ ای شخص تو یہ باتیں کسے کہہ رہا ہی۔ اس نے جواب میں کہا کہ اس سے جس نے ہم کو پیدا کیا اور یہ زمین و آسمان بنائے۔ حضرت موسےٰؑ نے کہا، ارے کم بخت! تو بجائے مسلمان ہونے کے کافر ہو گیا۔ یہ کیا بیہودگی، کیا کافرانہ بکواس اور کیا فضول باتیں ہی، اپنے منہ میں روئی ٹھونس، تیرے کفر کی بدبو سارے جہان میں پھیل گئی۔ تیرے کفر نے دین کے کمخواب میں پیوند لگا دیا۔ موزے اور پاتابے تجھے سزاوار ہیں، بھلا آفتاب کو ایسی چیزیں کیا ضرور۔ اگر تو ایسی باتوں سے زبان کو بند نہ کرے گا تو آتش (غیرت) ساری مخلوق کو جلا ڈالے گی۔ اگر تو خدا کو عادل و قادر جانتا ہی تو یہ بیہودہ بکواس تو نے کیوں اختیار کی۔ حق تعالیٰ ایسی خدمت گزاری سے بے پروا ہے۔ ارے احمق! ایسی باتیں تو کس سے کہہ رہا ہی؟ کیا چچا، ماموں سے کہہ رہا ہی، بھلا جسم و حاجت اس پاک بے ہمتا کی صفات میں کہاں۔ دودھ تو وہ پیے جس کا جسم اور عمر بڑھے گھٹے اور موزے وہ پہنے جو پانو کا محتاج ہو۔

چرواہے نے کہا کہ ای موسےٰؑ! تو نے میرا منہ بند کر دیا اور مارے پشیمانی کے میری جان جلا ڈالی، یہ کہہ کر کپڑے پھاڑ ڈالے۔ ایک آہِ سرد کھینچی اور جنگل میں گھس کر غائب ہو گیا۔ ادھر موسیٰؑ کو خدائے پاک سے وحی ہوئی کہ ای موسےٰؑ! تو نے ہمارے بندے کو ہم سے کیوں جُدا کر دیا۔ تو دنیا میں مخلوق کو ملانے آیا ہی یا جُدا کرنے آیا ہی؟ خبردار! جہاں تک ممکن ہو فراق میں قدم مت رکھ۔ ہم نے ہر شخص کی باطنی فطرت جُدا بنائی ہی اور ہر شخص کو جُدا بولی دی ہی۔ جو بات اس کے لیے اچھی ہی وہ تیرے لیے بُری ہی، وہی بات اس کے حق میں شہد کا اثر رکھتی ہی اور تیرے حق میں زہر کا۔ اس کے حق میں نور اور تیرے حق

میں نار۔ اس کے حق میں گلاب کا پھول اور تیرے حق میں کانٹا ہے۔ ہم پاکی و ناپاکی اور سخت و سبک جانی سب سے الگ ہیں۔ میں نے یہ مخلوق اس لیے نہیں بنائی کہ کوئی فائدہ کماؤں بلکہ میرا مقصد تو صرف اس قدر ہے کہ ان پر اپنے کمالات کا فیضان کروں۔ ہندیوں کو ہند کی بولی اچھی اور سندیوں کو سندھ کی بولی پسند ہے۔ ان کی تسبیح سے میں کچھ پاک نہیں ہو جاتا بلکہ جو موتی ان کے منہ سے جھڑتے ہیں ان سے وہ خود ہی پاک ہوتے ہیں۔ ہم کسی کے قول اور ظاہر کو نہیں دیکھتے۔ ہم تو آدمی کے باطن اور حال کو دیکھتے ہیں۔ اے موسیٰ داناؤں کے آداب اور ہیں۔ دل جلوں جان ہاروں کے آداب دوسرے ہیں۔

جب موسیٰؑ نے حق سے یہ عتاب سُنا تو بے تاب ہو کر جنگل میں اس چرواہے کو ڈھونڈنے نکلے۔ اس کا نقشِ قدم پہچانتے ہوئے اس قدر مارے مارے پھرے کہ سارے بیابان کی خاک چھان ڈالی۔ قاعدہ ہے کہ دیوانوں کا نقشِ پا دوسروں کے پاؤں کے نشان سے الگ ہوتا ہے۔ آخر کار آپ نے اسے تلاش کر لیا اور فرمایا کہ مبارک ہو، تجھے اجازت مل گئی۔ تجھے کسی ادب آداب اور قاعدے کی ضرورت نہیں تیرے جی میں جو آئے وہ تو کہہ تیرا کفر دین ہے اور تیرا دین نورِ جاں ہے۔ لہٰذا تجھے سب کچھ معاف ہے بلکہ تیرے دم سے ساری دنیا حفاظت میں ہے۔ اے شخص خدا کی مرضی سے تجھے معافی مل چکی لہٰذا تو بے تکلف جو زبان پر آئے وہ کہہ دے۔ چرواہے نے کہا، اے موسیٰؑ! اب میں اس قسم کی باتوں سے در گزرا، اب تو میں اپنے خونِ دل میں لتھڑا ہوا ہوں۔ اب تو میں سدرۃ المنتہٰی سے بھی آگے بڑھ چکا بلکہ اس کے بھی آگے لاکھوں برس کا راستہ طے کر چکا۔ تو نے جو میرے گھوڑے کو کوڑا لگایا تو وہ فوراً پلٹا اور ایک ہی جست میں سب آسمانوں کو طے کر گیا۔ اب میرا حال بیان سے باہر ہے اور جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ بھی میرا احوال نہیں ہے۔

اے شخص تو جو خدا کی تعریف اور حمد و سپاس کرتا ہے، تیرا حال بھی کچھ اس چرواہے سے بہتر نہیں ہے۔ تو سراسر ناقص اور جسمانی زندگی سے آلودہ ہے اور تیرا حال و قال بھی سب ناقص و گندہ

ہے۔ یہ محض اسی رحیم و کریم کی مہربانی ہے کہ وہ تیرے ناقص تحفے کو قبول فرمالے۔



ایک سونے والے کو جس کے حلق میں سانپ گھس گیا تھا ایک تُرک کا مُکّے مارنا

ایک تُرک گھوڑے پر سوار چلا آرہا تھا، دیکھا کہ ایک سوتے ہوئے شخص کے حلق میں سانپ گھس گیا۔ سوار نے دُور سے دیکھ کر بہتیرا گھوڑا دوڑایا کہ سونے والے کو بچائے مگر موقع نہ ملا۔ کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی تو اس نے چند گھونسے سونے والے کو مارے۔ سونے والا گہری نیند سے ایک دم اُچھل پڑا، دیکھا کہ ایک تُرک سوار گھونسے پہ گھونسا لگا رہا ہے۔ وہ تُرک تابڑتوڑ گھونسے مارتا رہا یہاں تک کہ سونے والا تاب نہ لاکر بھاگ کھڑا ہوا، آگے آگے وہ اور پیچھے پیچھے تُرک ایک درخت کے تلے پہنچے۔ وہاں جھڑے پڑے سیب بہت سے پڑے تھے، تُرک نے کہا کہ ای شخص ان سیبوں میں سے جتنے کھائے جائیں تو کھا اور خبردار ہرگز کمی نہ کر۔ تُرک نے اس کو اس قدر سیب کھلائے کہ سب کھایا پیا اُلٹ اُلٹ کر منہ سے نکلنے لگا۔ اس نے تُرک سے چلا کر کہا کہ ای امیر! آخر میں نے تیرا کیا بگاڑا تھا کہ تو میری جان کا لاگو ہوگیا۔ اگر تو میری جان ہی کا خواہاں ہے تو تلوار کے ایک ہی وار میں ختم کردے۔ وہ بھی کیا بُری گھڑی تھی جب کہ میں تجھے دکھائی دیا۔ وہ اسی طرح واویلا مچاتا اور بُرا بھلا کہتا رہا۔ تُرک نے پھر مُکّے لگانے شروع کیے۔ اس کا سارا بدن دُکھنے لگا اور تھک کر چور ہوگیا لیکن وہ تُرک شام کے جھٹپٹے تک اسی طرح پکڑ دھکڑ اور مار پیٹ کرتا رہا یہاں تک کہ صفرا کے غلبے سے اس کو ڈاک لگ گئی اور سارا کھایا پیا نکلنے لگا اور سانپ بھی اسی قے کے ساتھ باہر نکل آیا۔ جب اس نے اپنے پیٹ سے سانپ کو باہر نکلتے دیکھا تو مارے خوف کے تھر تھر کانپنے لگا اور سارے جسم کا درد جو گھونسے کھانے سے پیدا ہوگیا تھا یکلخت جاتا رہا۔ تُرک کے پاؤں پر گر پڑا اور کہنے لگا، تو تو رحمت کا فرشتہ یا میرا ولی نعمت خداوند

ہی۔ میں تو مر چکا تھا تو نے مجھے زندگی تازہ بخشی۔ ای خداوند، شہنشاہ اور امیر اگر تو اصل حال ذرا بھی مجھے بتا دیتا تو میں تیرے ساتھ ایسی بکواس کیوں کرتا۔ مگر تو نے تو اپنی چپ سے مجھے برہم کر دیا کہ وجہ بتائے بغیر میرے سر پر گھونسے مارنے لگا۔ ای نیکوکار! مجھے معاف کر جو کچھ بے اوسانی میں میرے منہ سے نکل گیا اسے بخش دے۔ تُرک نے کہا کہ اگر میں اس کا اشارہ بھی دیتا تو اسی وقت تیرا پتّا پانی ہو جاتا اور مارے خوف کے تیری جان ہی آدھی رہ جاتی اِس وقت نہ تو تجھے اس قدر سیب کھانے کی قوت رہتی اور نہ قے کرنے کی نوبت آتی اسی لیے میں تیری فحش کلامی سنتا اور صبر کرتا رہا۔ سبب بتانا مناسب نہ تھا اور تجھے چھوڑنا مجھ سے ممکن نہ ہؤا۔

ای عزیز! عاقلوں کی دُشمنی بھی ایسی ہوتی ہی کہ ان کا دیا ہؤا زہر جان کو نشو و نما دیتا ہی۔ اس کے برعکس بے وقوفوں کی دوستی میں صدمہ اور گمراہی حاصل ہوتی ہی چنانچہ مثال کے طور پر یہ حکایت سنو +



بے وقوف کا بھروسا ریچھ کی دوستی پر

ایک اژدہا ریچھ کو کھینچ رہا تھا، ایک دلاور پہلوان اُدھر سے گزرا اور ریچھ کی مدد پر آمادہ ہؤا۔ اژدہے کی سخت گرفت سے ریچھ چلّایا تو دلاور نے اس کو اژدہے کے قبضے سے چھڑا دیا۔ وہ داؤ پیچ بھی جانتا تھا اور قوت بھی رکھتا تھا۔ اس نے اژدہے کو مار ڈالا۔ اژدہے کو اس نے ایسے داؤ سے بے بس کیا کہ ریچھ جسمانی ہلاکت سے بچ گیا۔ اژدہے میں قوت تو بہت ہوتی ہی مگر داؤ پیچ وہ نہیں جانتا۔ غرض ریچھ کو اژدہے نے چھٹکارا ملا اور اس جواں مرد پہلوان کی ہمتِ مردانہ کا شکر گزار ہؤا تو سگِ اصحابِ کہف کی طرح اُس کے ساتھ ہو گیا۔ وہ شخص تھکا ہؤا تھا۔ ایک جگہ آرام

لینے کے لیے لیٹ گیا اور ریچھ ازراہِ محبت پاسبانی کرنے لگا۔ ایک راہ گیر نے جو یہ حال دیکھا تو پوچھا کہ ای بھائی خیر تو ہی، یہ ریچھ تیرا کون ہی ؟ اس نے سارا قصہ اور اژدہے کا واقعہ سُنا دیا۔ راہ گیر نے کہا، ارے سادہ دل ! ریچھ پہ اعتبار مت کر۔ نادان کی دوستی دشمنی سے بدتر ہی، جس چال سے بھی ممکن ہو اسے ماربھگا۔ اس نے جواب دیا کہ خدا کی قسم تو ازراہِ حسد کہتا ہی ورنہ بجائے اس کے ریچھ پن کے اس کی محبت کو دیکھتا۔ اس نے کہا کہ نادانوں کی محبت بہت چکنی چپڑی ہوتی ہی لیکن میرا یہ حسد اس کی محبت سے بہتر ہی۔ ارے بھلے مانس ! میں ریچھ سے تو کم نہیں ہوں، اس کو ترک کر دے تاکہ میں تیرا رفیق رہوں۔ میرا دل بُری فال کے خیال سے لرزنے لگتا ہی، اس ریچھ کے ساتھ کسی گھنے جنگل میں نہ جائیو۔ میرا دل جو کانپتا ہی سو یہ وہم نہیں ہی بلکہ یہ خدا کا نور ہی، جھوٹا دعویٰ اور خواہ مخواہ کی ترنگ نہیں ہی۔ میں مومن ہوں اور مومن خدا کے نور سے دیکھتا ہی۔ دیکھ خبردار اس آتش کدے سے دور بھاگ۔ اس نے بہتیرا کہا مگر اس بے وقوف نے ایک نہ سُنی۔ بدگمانی آدمی کے آگے بڑی پکی دیوار ہو جاتی ہی۔ ناصح نے کہا کہ جب تو دوستی کی بات نہیں مانتا تو لے الوداع۔ اس نے جواب دیا کہ چل اپنا راستہ لے۔ تو میرا ایسا غم خوار کہاں کا آیا۔ چلتے چلتے اس نے پھر کہا کہ دیکھ میں تیرا دشمن نہیں ہوں، تیرے لیے بھلائی اسی میں ہی کہ تو میرے ساتھ ہولے۔ اس نے کہا کہ مجھے اب نیند آ رہی ہی تو میرا پیچھا چھوڑ اور اپنا راستہ لے۔

وہ بدگمان نادان اور نااہل تھا۔ اس نے اپنے کتے پن کی وجہ سے عقل مند ناصح پر حسد کی تہمت لگائی اور ریچھ کو محبت اور وفا کا پتلا سمجھا۔ آخرکار اس مسلمان نے نادان سے کترائی لی اور منہ ہی منہ میں لاحول پڑھتا ہوا اپنا راستہ لیا اور اپنے جی میں کہا کہ جب نصیحت، اصرار، زبردستی سے اس کی بدگمانی اور بڑھتی ہی تو پند و نصیحت کی راہ بند ہو گئی اور ایسے لوگوں سے منہ پھیر لینا واجب ہو گیا۔

ادھر جب وہ شخص سوگیا اور ریچھ مکھیاں جھلتا رہا ، مکھیاں بار بار آنے لگیں اور یہ بار بار اُڑاتا رہا۔ اس طرح اس نے کئی بار اس جوان کے منہ پر سے مکھیاں اُڑائیں مگر مکھیاں بار بار پلٹ کر وہیں جمع ہو جاتی تھیں۔ آخرکار بیزار ہو کر ایک طرف دوڑا ہوا گیا اور پہاڑ سے ایک بڑا پتھر اُٹھا لایا۔ اس نے دیکھا کہ مکھیوں کے گچھے کے گچھے اس نیند کے متوالے کے منہ پر چمٹے ہوئے ہیں۔ بس اس نے پتھر اُٹھایا اور اس ارادے سے کہ یہ مکھیاں نہ اُڑیں نہ منہ پر بیٹھیں سونے والے کے منہ پر مارا۔ پتھر نے سونے والے کے منہ کو خشخاش کی طرح پاش پاش کر دیا اور تمام دنیا کے لیے یہ ضرب المثل بنا دی کہ نادان کی محبت اس ریچھ کی محبت کے برابر ہے لہٰذا اس کا کینہ عین مہر اور مہر عین کینہ ہے ✚



دیوانے کا جالینوس کی طرف توجّہ کرنا

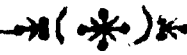
جالینوس نے اپنے شاگردوں سے کہا کہ مجھ کو فلاں دوا نکال دو۔ ایک شاگرد نے اس سے پوچھا کہ حضرت ! یہ دوا تو جنون میں دی جاتی ہے۔ آپ کی جان سے دُور ، بھلا یہ دوا آپ کھائیں گے؟ کہا کہ ہاں ! میری طرف ایک دیوانہ متوجّہ ہوا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک تو مجھے گھورتا رہا ، پھر مجھے آنکھ ماری اور اس کے بعد میری آستین پھاڑ ڈالی۔ اگر مجھ میں کوئی ہم جنسی کی بات نہ پاتا تو وہ میری طرف رُخ ہی کیوں کرتا۔ جب دو شخص آپس میں ملیں تو یقین کرنا چاہیے کہ ان میں کوئی مشترک نسبت موجود ہے۔ کوئی پرندہ بغیر اپنے ہم جنس غول کے کب اُڑتا ہے۔ اس کی تمثیل میں ایک شخص نے بیان کیا کہ میں نے ایک بیابان میں کوّے اور کلنگ کو بڑے چاو سے پاس پاس بیٹھے دیکھا ، میں یہ حال دیکھ کر اس فکر میں ڈوب گیا کہ ان میں مشترک تعلق کیا ہوگا۔ اسی حیرت میں جب میں ان کے نزدیک پہنچا تو میں نے دیکھا کہ وہ دونوں لنگڑے تھے ✚



ایک صحابی کا بیمار ہونا اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عیادت کو جانا

صحابہ میں سے ایک صاحب بیمار اور سوکھ کر کانٹا ہو گئے۔ چونکہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصلت سراپا لطف و کرم تھی اس لیے آپ بیمار پرسی کے لیے تشریف لے گئے۔ وہ صاحب آنحضرتؐ کے دیدار سے زندہ ہو گئے جیسے خدا نے اسی وقت پیدا کیا۔ کہنے لگے کہ اس بیماری نے میرا اقبال اس قدر بلند کیا کہ صبح سویرے یہ بادشاہ میرے گھر آیا۔ واہ یہ بیماری، تکلیف اور بخار کیسا بھاگوان اور یہ درد اور رات کی جاگ کیسی مبارک ہے۔ حضرت پیغمبرؐ نے اس بیمار سے کہا کہ شاید تو نے کوئی نامناسب دعا کی ہے۔ تو نے نادانستگی میں زہر کھا لیا ہے۔ یاد کر تو نے کیا دعا کی اور نفس کے کس مکر میں مبتلا ہو گیا۔ بیمار نے کہا کہ مجھے یاد نہیں مگر چاہتا ہوں کہ آپ کی ہمت میری مدد کرے کہ وہ دعا یاد آ جائے۔ آخر جناب مصطفیٰؐ کے نور بخش دیدار کی برکت سے وہ دعا اس کے ذہن کے سامنے آ گئی۔ وہ روشنی جو حق کو باطل سے جدا کرنے والی ہے اس روزن سے چمکی جو ایک دل سے دوسرے دل تک چلا گیا ہے۔ اس نے کہا کہ لیجیے وہ دعا مجھے یاد آ گئی جو میں بے خیالی میں کہہ گیا تھا۔ میں گناہوں میں گرفتار و غرق ہو کر ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ آپ ہمیشہ مجرموں کو سخت عذابوں سے منع کرتے اور سزائے اعمال کا خوف دلاتے تھے اس سے میں بے تاب ہو جاتا تھا۔ نہ مجھے اپنی حالت پر صبر آتا تھا نہ بچنے کی کوئی سبیل تھی، نہ توبہ کی امید تھی نہ لڑنے کا موقع اور نہ خدائے تعالیٰ کے بغیر میرا کوئی مددگار۔ میرے دل کے وسوسے اس قدر دشوار ہو چکے تھے۔ میں یہی کہتا تھا کہ خدایا میرے اعمال کا جو عذاب ہو گا وہ اسی عالم میں جلد مجھ پر جاری فرما تا کہ آخرت میں بے فکر رہوں۔ میں اسی دعا پر اڑ کر بیٹھ جاتا تھا (رفتہ رفتہ) ایسی بیماری بڑھی کہ میری جان گھل گھل کر بے آرام ہونے لگی۔ اب تو میرا ذکر و وظیفہ بھی جاتا رہا اور برے بھلے، اپنے بیگانے سب سے غافل ہو گیا۔ اگر میں اب آپ کا مبارک

چہرہ نہ دیکھتا تو میں دفعتًہ ہاتھ سے جاتا رہتا، آپ نے بڑی شاہانہ غم خواری فرمائی۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ خبردار ایسی دعا پھر کبھی نہ کرنا، اپنے آپ کو جڑ پیڑ سے نہ اکھیڑنا۔ ای بیمار چیونٹی تجھ میں یہ بل بوتہ کہاں کہ خدا تعالیٰ تجھ پر اتنا بڑا پہاڑ رکھے۔ صحابی نے کہا، توبہ توبہ! ای سلطان اب میں نے عہد کرلیا کہ آیندہ کبھی بے سوچے سمجھے کوئی بڑ نہ ہانکوں گا۔ ای رہ نماؤں کے رہ نما اس بیابان میں آپ ہی ہمیں راہ دکھائیے اور اپنی رحمت سے مجھے نصیحت فرمائیے۔ حضرت پیغمبرؐ نے اس بیمار کو تعلیم دی کہ تو خدا سے یہ دعا کر کہ وہ تیری مشکلوں کو آسان کرے۔ ای خدا تو دُنیا اور دین دونوں جگہ ہمیں راحت و خیر عنایت فرما۔ ہماری منزل تو تو ہی ہے۔ راستہ کو بھی مثل باغ و بستان کے ہم پر خوش گوار کردے ❖



موسیٰؑ کو حق تعالیٰ سے وحی ہونا کہ ہماری بیمار پُرسی کو کیوں نہیں آیا

خدا کی طرف سے موسیٰؑ پر یہ عتاب ہوا کہ ای شخص کہ تو نے اپنی جیب و گریبان سے سورج کو نکلتے دیکھا ہے۔ ہم نے تجھ کو خدائی نور کا مشرق بنایا ہے باوجود اس کے میں بیمار ہُوا تو تو پرسش تک کو نہ آیا۔ موسیٰؑ نے عرض کی ای پاک بے نیاز تو تو ہر نقصان و زوال سے بری ہے، تیرے اس شکوے میں کیا نکتہ ہے، ظاہر فرما۔ پھر حکم ہُوا کہ میں بیمار رہوں تو نے ازراہِ محبت مجھے پوچھا تک نہیں۔ موسیٰؑ نے کہا ای رب! تجھ میں تو کوئی گھٹاو نہیں، تیرے سوال سے میری عقل گم ہوئی جاتی ہے، میری اس گتھی کو سُلجھا۔ حکم ہُوا کہ میرا ایک خاص مقبول بندہ بیمار ہو گیا ہے۔ اس بات کو غور سے دیکھو۔ اس کی بیماری میری بیماری اور اس کی معذوری میری معذوری ہے۔

جو شخص خدا کی ہم نشینی چاہے اُس کو چاہیے کہ اولیا کی صحبت میں بیٹھے۔ اگر اولیا کی خدمت سے تو جُدا ہوگا تو جان لے کہ ہلاک ہُوا کیوں کہ تو جزو ہے کُل نہیں ہے۔ شیطان جس

کسی کو اہلِ کرم سے دُور کر دیتا ہے تو اس کو بے یار و مددگار کر کے سر پھوڑ کر کھا جاتا ہے۔ ذرا سی دیر کو بھی اپنی جماعت سے جُدا ہونا بُرا ہے اور خوب جان لو کہ وہ شیطان کا مکر ہے۔



ایک باغبان کا صوفی وفقیہ وعلوی کو ایک دوسرے سے جُدا کرنا

ایک باغبان نے دیکھا کہ اس کے باغ میں تین آدمی چوروں کی طرح گھس آئے ہیں۔ ان میں سے ایک فقیہ ایک سیّد اور ایک صوفی ہے اور ایک سے بڑھ کر ایک سرکش و گستاخ ہے۔ اس نے اپنے جی میں کہا، مجھے ان کو قرار واقعی سزا دینا لازم ہے لیکن یہ سب یک دل ہیں اور جماعت بڑی قوت ہے۔ میں اکیلا ان تین آدمیوں سے سر بر نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا تدبیر یہی ہے کہ پہلے ان کو ایک دوسرے سے جُدا کر دوں۔

یہ سوچ کر پہلے اس نے صوفی سے کہا کہ حضرت ذرا میرے گھر جاؤ اور ان اپنے ساتھیوں کے لیے ایک کمبل لے آؤ۔

جب صوفی کچھ دُور چلا گیا تو اس کے ساتھیوں سے کہنے لگا، کیوں صاحب آپ تو فقیہ اور یہ دوسرے نامدار سیّد ہیں۔ ہم تمھارے فتوے پر روٹی کھاتے ہیں اور تمھاری ہی عقل کے پروں پر اُڑتے ہیں۔ اور یہ دوسرے شہزادے اور ہمارے بادشاہ ہیں کیوں کہ سیّد اور خاندان حضرت مصطفےٰ سے ہیں۔ لیکن اس بڑپیٹے صوفی میں کون سا سُرخاب کا پر ہے جو وہ تم جیسے بادشاہوں کے ساتھ رہے۔ اگر وہ واپس آئے تو اس کو روئی کی طرح دُھنک ڈالو اور تم لوگ ایک ہفتے تک میرے باغ و سبزہ زار میں قیام کرو اجی باغ صدقے کیا تھا، میری جان تمھاری ہے بلکہ تم تو میری دونوں آنکھ ہو۔ ایسی چکنی چُپڑی باتوں سے ان کو رجھایا اور خود ڈنڈا لے کر صوفی کے پیچھے چلا اور اسے پکڑ کر کہا، کیوں رے کُتّے صوفی تو بے غیرتی سے لوگوں کے باغ میں درانہ گھس آتا ہے۔ یہ طریقہ کیا تجھ کو جنیدؒ

نے بتایا یا بایزیدؒ نے ۔ بتا تو سہی کس شیخ اور کس پیر سے ایسی اجازت پہنچی ۔ یہ کہہ کر صوفی کو خوب دُھنکا، اس کو ادھ مُوا کر دیا اور سر پھاڑ ڈالا ۔ صوفی نے جی میں کہا کہ جو کچھ مجھ پہ آئی تھی وہ تو آ گئی مگر ہم نشینو! ذرا اپنی خبر لو ۔ تم نے مجھے غیر جانا حالانکہ میں اس بے حمیت مرد سے زیادہ غیر نہ تھا ۔ جو کچھ میں نے کھایا ہے تمھیں بھی یہی کھانا ہے اور بات بھی یہ ہے کہ بدمعاش کو ایسی ہی سزا ملنی چاہیے ۔ جب باغبان نے صوفی کو ٹھیک بنا دیا تو ویسا ہی ایک بہانہ اور تراشا اور کہا کہ ای میرے شریف سیّد صاحب! آپ میرے غریب خانے تشریف لے جائیں کہ میں نے آپ کے دوپہر کے کھانے کے لیے پوریاں تیار کرائی ہیں ۔ میرے دروازے پر جا کر لونڈی کو آواز دیجیے وہ آپ کو پوریاں اور بھنی ہوئی قاز لا دے گی ۔ جب اس کو رخصت کر دیا تو فقیہ سے کہنے لگا کہ ای دین دار! یہ تو ظاہر ہے اور مجھے بھی یقین ہے کہ تو فقیہ ہے مگر یہ آپ کا ساتھی سیادت کا دعویٰ بے دلیل کرتا ہے ۔ کون جانتا ہے کہ اس کی ماں نے کیا کیا ۔ غرض اس سیّد کو خوب صلواتیں سُنائیں ۔ فقیہ چپ بیٹھا سنتا رہا ۔ وہ بد ذات اس سیّد کے پیچھے پیچھے چلا اور راستے میں روک کر کہا، ای گدھے! اس باغ میں تجھے کس نے بُلایا تھا ۔ کیا یہ چوری کی میراث تجھ کو پیغمبرؐ سے پہنچی ہے ۔ شیر کا بچّہ تو شیر ہی ہُوا کرتا ہے، اب تو بتا کہ پیغمبرؐ کے مقابلے میں تو کیا ہے ۔ پھر اس لفنگے نے بد ذاتی سے سیّد کے ساتھ وہ کیا جو خارجی اولادِ رسولؐ کے ساتھ کرے ۔ جب وہ سیّد اس ظالم کی مار دھاڑ سے نڈھال ہو گیا تو آنکھوں میں آنسو بھر کر اس نے فقیہ سے کہا کہ میاں ٹھیرو! تم اب اکیلے رہ گئے ہو، اس تمھاری توند پر وہ دھتّواں دھوں ہو گی کہ نقارہ بن جائے گی ۔ اگر میں سیّد نہیں اور تیری رفاقت و ہمدمی کے لائق نہیں ہوں تو ایسے ظالم سے تو میں بدتر نہیں ہوں ۔

ادھر جب وہ باغبان اس سے بھی فارغ ہو گیا تو فقیہ کی جانب مخاطب ہُوا اور کہا کہ ای فقیہ! تو سارے بدذاتوں کا سرغنہ ہے ۔ ارے خدا تجھے لُنجا ٹُنڈا کرے، کیا تیرا

یہی فتویٰ ہی کہ کسی کے باغ میں بے دھڑک گھس آئے اور آنے کی اجازت بھی طلب نہ کیجے ارے بدتمیز، ایسا فتویٰ تجھ کو ابوحنیفہ نے دیا یا شافعی نے۔ کیا تو نے ایسی اجازت وسیط (کتاب فقہ) میں پڑھی یا یہ مسئلہ محیط (کتاب فقہ) میں درج ہی۔ اتنا کہہ کر اس ہست چھٹ نے فقیہ کی وہ مرمّت کی کہ دل کا پورا بخار نکال لیا۔ فقیہ نے کہا، بے شک تجھے حق ہی، مارنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھ، جو اپنوں سے جُدا ہو جائے اس کی یہی سزا ہی۔ اتنی سزا کا نہیں بلکہ اس سے سوگنی سزا کے لائق ہوں، آخر میں اپنے ذاتی بچاؤ کے مارے اپنے ہمدموں سے کیوں جُدا ہوًا۔

غرض جو شخص اپنے ساتھیوں سے الگ ہو کر اکیلا رہ جاتا ہی اس پر ایسے ہی مصائب آتے ہیں ۔



مُرید کا مکان تعمیر کرنا اور پیر کا امتحان لینا

ایک مرید نے نیا گھر بنایا، پیر گھر دیکھنے آئے۔ پیر نے امتحان کی خاطر اپنے مرید سے پوچھا، اے رفیق! یہ روشن دان تم نے کیوں بنایا، جواب دیا اس لیے کہ اس کے ذریعے سے اندر روشنی آئے۔ شیخ نے فرمایا کہ وہ تو فرع ہی، اصل غرض یہ ہونی چاہیے تھی کہ اس ذریعے سے اذان کی آواز آئے گی۔ روشنی تو اپنے آپ آ ہی جاتی مگر نیّت وہ کرنی چاہیے جو تیرے لائق ہو۔

یہ وہ نکتہ ہی جس کی تعلیم اس حدیث شریف میں دی گئی ہی کہ آدمی کے عمل کا مدار اس کی نیّت پر ہوتا ہی ۔



سائل کا حیلے سے بہلول سے بھید کہوالینا

ایک شخص یہ کہہ رہا تھا کہ مجھے ایسا عقل مند چاہیے جس سے آڑے وقت مشورہ لیا کروں۔ کسی نے کہا کہ ہمارے شہر میں تو سوائے اس مجنون صورت کے اور کوئی عاقل نہیں۔ دیکھ وہ شخص سرکنڈے پر سوار بچوں میں دوڑتا پھرتا ہے۔ ظاہر میں تو دن رات گیند کھیلتا پھرتا ہے مگر باطن میں پوشیدہ خزانہ ہے۔ سائل نے بھی حیلہ کیا اور بہلول سے کہا، اے سوار! ایک لحظے کے لیے گھوڑے کا رُخ ادھر پھیر دیجیے۔ فوراً اس کی طرف سرکنڈا بڑھا کر کہا کہ ہاں جلدی کہو کیوں کہ میرا گھوڑا بہت منہ زور اور تیز ہے۔ جلدی کر، کہیں تجھے لات نہ مار دے، جو کچھ تو پوچھنا چاہتا ہے جلدی پوچھ۔ جب اس نے دل کا بھید کہنے کا کوئی موقع نہ دیکھا تو اس نے اپنے دل کے بھید کو چھپا کر دل لگی شروع کردی کہ بہلول کا بھید معلوم کرے۔ کہنے لگا میں نکاح کے لیے ایک عورت کی تلاش میں ہوں، مجھ جیسے آدمی کے لیے کیسی عورت چاہیے۔ آپ نے فرمایا کہ جہان میں تین قسم کی عورتیں ہیں ان میں دو کھوٹی ایک چلنی[1] سکہ ہے۔ لہٰذا اگر اس سے نکاح کیا تو پوری کی پوری تیری جورو رہے گی۔ اور جو دوسری ہے سو وہ آدھی تیری ہے اور آدھی تجھ سے الگ اور وہ تیسری یاد رکھ کہ بالکل تیری نہیں، سُن لیا، چل دور ہو، میں تو چلا۔ کہیں میرا گھوڑا ایسی لات رسید نہ کرے کہ تو گر پڑے اور پھر ابد تک اُٹھ نہ سکے۔ شیخ سرکنڈے کا گھوڑا دوڑاتے چلے گئے مگر اس جوان نے دوبارہ آواز دی کہ، اجی حضرت چلے کہاں، یہاں تو آؤ، یہ جو تم نے تین قسم کی عورتیں بتائیں تو ان کی علامت و شناخت تو بتاؤ۔ آپ نے پھر گھوڑا روکا اور فرمایا کہ اگر کنواری

---

[1] چلنی سکہ = سکۂ رائج الوقت

سے شادی کرے گا تو وہ پوری تیری ہوگی اور تو بے فکر رہے گا اور جس کو میں نے آدھی جورو بتایا وہ بیوہ عورت ہوتی ہے۔ اور وہ جس کو میں نے جوروگیری ہی سے خارج بتایا وہ بال بچوں والی بیوہ ہے، ایسی عورت کے چونکہ پہلے شوہر سے بچے ہوتے ہیں اس لیے اس کی محبت اور دلی توجہ تمام تر اسی طرف ہوتی ہے۔ بس چل دے کہیں میرا گھوڑا لات نہ مارے اور میرے شریر گھوڑے کے سُم کا نشان بیٹھ جائے۔ شیخ نے ہاہا ہا، اہو ہو ہو کے نعرے لگائے اور اپنا گھوڑا پلٹا کر بچوں کو پاس بلانے لگے۔ اس سائل نے پھر چلا کر کہا کہ اے میاں بادشاہ ایک سوال اور رہ گیا ہے، ذرا وہ بھی بتاتے جاؤ۔ آپ نے پھر گھوڑے کو پھیر کر پوچھا کہو وہ کیا ہے، جلدی کہو، دیکھو، وہ بچہ میری گیند اُڑا لے گیا۔ اس نے کہا کہ اے بادشاہ اس قدر عقل و تمیز کے باوجود یہ کیا مکر کا جال بچھا رکھا ہے۔ تو تو عقلِ کُل سے بھی آگے اور گفتار میں آفتاب وقت ہے پھر جنون میں کیوں چھپ گیا۔ آپ نے فرمایا کہ ان نفس پرستوں کی رائے یہ قرار پائی تھی کہ مجھے اس شہر کا قاضی بنائیں۔ میں نے معذرت کی تو اڑ گئے کہ جب تم جیسا کوئی صاحب علم نہیں ہے تو باوجود اس کے حرام اور ناسزا وار ہے کہ کوئی کم علم شخص احکامِ قضا نافذ کرے۔ شریعت نے یہ اجازت ہی نہیں دی ہے کہ ہم تیرے ہوتے ہوئے کسی دوسرے کو اپنا قاضی اور پیشوا تسلیم کریں۔ اس مجبوری سے میں دیوانہ ہو کر واہی تباہی پھرنے لگا اور اپنی معذوری کی بنا پر اس گروہ سے اپنا پیچھا چھڑایا۔ اگرچہ ظاہر میں مجھے خلل دماغ معلوم ہوتا ہے لیکن باطن میں ویسا ہی ہوں جیسا کہ پہلے تھا۔ میری عقل گنج ہے اور میں ویرانہ ہوں اگر میں اپنا خزانہ عوام پر ظاہر کردوں تو یہ دیوانگی ہوگی۔ لہٰذا اب میں قند کی کان یا گنے کا کھیت ہوں، مجھ سے شیرینی اُگتی ہے اور اس کو میں ہی کھاتا ہوں۔

بعض دفعہ ایسا وقت آتا ہے کہ اہلِ خرد کو اپنی خردمندی چھپانے ہی میں خیریت نظر آتی ہے۔

کوتوال کا ایک شرابی کو قید خانے کا حکم دینا اور اس کا جواب

ایک رات کو کوتوال گشت کرتا ہوا ایک جگہ پہنچا، دیکھا کہ دیوار کے نیچے ایک شخص پڑا سو رہا ہے۔ کوتوال نے کہا، ہے ہے تو تو بدمست معلوم ہوتا ہے۔ سچ بتا تو کیا پی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ جو صراحی میں ہے وہی پی ہے۔ کوتوال نے سوال کیا کہ آخر صراحی میں کیا ہے صاف صاف بتا۔ اس نے کہا کہ وہی جو میں نے پی ہے۔ کوتوال نے کہا کہ تو بات ڈھکی ہوئی کہتا ہے۔ پھر کوتوال نے مکرر سوال کیا کہ تو نے جو شے پی ہے وہ کیا ہے، بس اس کا جواب دے۔ اُس نے پھر وہی جواب دیا کہ وہی جو اس صراحی میں چھپی ہوئی ہے۔ یہ سوال و جواب یوں ہی ہوتے رہے اور کوتوال صاحب گدھے کی طرح کیچڑ میں پھنسے رہے۔ اس سے محتسب نے کہا کہ اچھا منہ کھول کر آہ تو کر، شرابی نے منہ کھول کر ہؤ ہؤ کرنی شروع کر دی۔ کوتوال نے کہا کہ ہائیں! میں نے آہ کرنے کو کہا تو ہو ہؤ کرتا ہے، اس نے کہا آہ تو درد و غم کے موقع پر ہوا کرتی ہے اور شرابیوں کی ہا و ہؤ مارے خوشی کے ہوتی ہے۔ کوتوال نے کہا کہ میں ان باتوں کو نہیں جانتا، بس کھڑا ہو، زیادہ زبان زوری نہ کر۔ متوالے نے کہا، ارے چل نکل، تو کون اور میں کون۔ کوتوال نے کہا، تو نے شراب پی ہے، قید خانے تک چل۔ اس نے کہا اے کوتوال چل دُور ہو، بھلا ننگے سے بھی کوئی چیز گروی رکھی جا سکتی ہے۔ اگر مجھ میں چلنے کی قوت ہوتی تو اپنے گھر کیوں نہ جاتا اور یہ واقعہ ہی کیوں پیش آتا۔ اگر میں عقل اور ہوش و حواس میں ہوتا تو پیروں کی طرح کوئی دُکان جماتا۔ یہاں کیوں پڑا ہوتا۔



ابلیس کا نماز کے لیے معاویہؓ کو بیدار کرنا

روایت ہے کہ امیر معاویہؓ اپنے کمرے کے ایک گوشے میں سو رہے تھے، چونکہ لوگوں

کی ملاقاتوں سے تھک گئے تھے اس لیے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرلیا تھا۔ یکایک ایک شخص نے جگا دیا اور جب ان کی آنکھ کھلی تو غائب ہوگیا۔ آپ نے اپنے جی میں کہا کہ اس کمرے میں تو کوئی بھی آ نہ سکتا تھا پھر یہ کون تھا جس نے ایسی شرارت اور جرأت کی۔ آپ نے اس کی جستجو میں سارے کمرے کا چکر لگایا یہاں تک کہ اس روپوش کا پتہ لگ گیا۔ آپ نے بت کی آڑ میں ایک شخص کو دیکھا جو پردے سے اپنا منہ چھپائے ہوئے تھا، آپ نے فرمایا، ہائیں! ارے تو کون، تیرا نام کیا۔ اس نے جواب دیا کہ میرا نام الم نشرح ہی میں ابلیس ہوں۔ آپ نے پوچھا کہ تو نے مجھے کیوں بیدار کیا، سچ کہہ کوئی غلط وجہ نہ بتانا۔ اس نے کہا کہ حضرت! نماز کا وقت ختم ہوئے آیا اب مسجد کو لپکنا چاہیے۔ خود حضرت رسول اللہ صلعم نے وحدت کا موتی یوں پرویا ہے "عجّلوا الطاعات قبل الفوت" یعنی قبل اس کے کہ وقت نکل جائے ادائے عبادت میں جلدی کرو۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں، تیری یہ غرض ہرگز نہیں ہوسکتی کہ نیکی کے کام میں میری رہ نمائی کرے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ چور چھپواں میرے گھر میں آئے اور کہے کہ میں پاسبان ہوں۔ میں چور کی بات کا کیوں کر یقین کرلوں، چور مزدوری کے فائدے کو کیا جانے۔ ارے تو تو بڑا رہزن چور ہے اور تو مجھ پر اس قدر مہربان ہو جائے۔ ابلیس نے کہا کہ ہم فرشتے بھی رہ چکے ہیں اور طاعت وعبادت کے راستے کو جان و دل سے طے کر چکے ہیں۔ ہم اہلِ سلوک کے ہم راز اور عرش کے رہنے والوں کے ہمدم تھے۔ لہٰذا پرانی عادت ایک دم کیسے بدل جائے اور اس عادت کی محبت دل سے کیوں کر جاتی رہے۔ بزمانۂ سفر چاہے تو روم دیکھے چاہے ختن دیکھے لیکن وطن کی محبت کا نقش دل سے کیوں کر مٹ سکتا ہے۔ ہم بھی اس شراب میں مست رہ چکے ہیں اور اس کی درگاہِ عالی کے عاشقوں میں سے تھے۔ امیر (معاویہؓ) نے کہا کہ یہ باتیں تو سچ ہیں لیکن یہ تیرے حصے میں نہیں۔ لاکھوں کو تو نے گمراہ کیا اور کوہل لگا کر خزانے میں گھس آیا۔ تو تو مجسم آگ ہے، تجھے بغیر جلائے چارہ نہیں

اور وہ کون ہی جس کا دامن تیرے ہاتھ سے چاک نہیں۔ باتیں نہ بنا، مجھ پر تیرا قبضہ ممکن نہیں۔ تو رہزن ہی اور میں مسافر بیوپاری ہوں تو مشتبہ مال کیسے ہی دھوکے سے لائے بھلا میں کب خریدنے والا ہوں۔ ای فریبی، سچ سچ بتا، تو نے کس مصلحت سے مجھے بیدار کیا۔ کیونکہ اب میرے ساتھ بہانہ بازی نہیں چلے گی، اپنی غرض صاف صاف بیان کر۔ ابلیس نے کہا کہ جو شخص فطرۃً بدگمان ہوتا ہی وہ باوجود سو قرینوں کے بھی سچائی قبول نہیں کرتا۔ ہر دل جس میں کچھ سوچ بچار ہوتی ہی جب اس پر کوئی دلیل پیش کی جاتی ہی تو اس کے خیال کو اور تقویت ہو جاتی ہی۔ ای نیک مرد! تو خدا سے میرا رونا کیا روتا ہی تو اپنے ہی نفس کی شرارتوں کا رونا رو۔ تو حلوا کھاتا ہی اس سے بوجہ فسادِ خون تجھے ڈُنبل ہو جاتے ہیں، بخار آنے لگتا ہی اور طبیعت بگڑ جاتی ہی لیکن چونکہ تو اپنے کیے پر نظر نہیں رکھتا اس لیے ابلیس کو بے قصور لعنت کرتا ہی۔ امیر (معاویہؓ) نے کہا کہ جب تک سچ نہ کہے گا میں تجھے نہ چھوڑوں گا۔ اگر سچ بتائے گا تو میرے قبضہ سے نجات پائے گا۔ ابلیس نے کہا ای سوچ بچار والے، شک و شبہ سے لبریز! آپ سچ اور جھوٹ کو کیوں کر پہچانتے ہیں۔ امیر (معاویہؓ) نے جواب دیا کہ حضرت پیغمبرؐ نے اس کی پہچان بتائی ہی اور کھوٹے کھرے کی کسوٹی مقرر کر دی ہی وہ یہ کہ آپ نے فرمایا کہ جھوٹ دلوں میں کھوٹ پیدا کرتا ہی اور سچ اطمینان بخشتا ہی۔ جھوٹ بات سے دل کو تسکین نہیں ہوتی جس طرح کہ پانی اور تیل کے ملنے سے روشنی نہیں ہوتی۔ سچی بات سے دل چین پاتا ہی کیوں کہ سچائی مرغِ دل کی گرفتاری کے لیے دانہ ہی۔ میں نے اپنی عادت و کردار کو حرص و ہوا سے پاک کر لیا ہی، میں نے شہوت کے لقمے ترک کر دیے ہیں۔ میرا ضمیر اتنا روشن ہو گیا ہی کہ سچ کو جھوٹ سے الگ کر لیتا ہی۔ ای ملعون کتّے! تو میرا جواب دے، سچ کہہ اور جھوٹے بہانے مت کر۔ کہ تو نے مجھے کیوں بیدار کیا، حالانکہ ای دغا باز! تو بیداری کا دشمن ہی۔ تو تو خشخاش کی طرح خواب آور ہی، بلکہ تو مثل شراب کے ہی کہ عقل کو غائب کر دیتا ہی۔ دیکھ میں نے تجھے

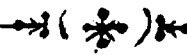
چار میخ کر دیا ہے ، اب صاف صاف بتا ، حیلے حوالے مت کر ۔ سچ کو میں جانتا ہوں ۔ میں ہر شخص سے وہ بات سننی چاہتا ہوں جو اس کی طبیعت اور خو خصلت کے مطابق ہو ۔ چونکہ شیطان غیر ہے اس لیے میں یہ امید نہیں رکھتا کہ وہ ازراہ نیکی مجھے بیدار کرے ۔ الغرض شیطان نے بہتیری مکر و فریب کی باتیں بنائیں لیکن امیر (معاویہؓ) نے ایک نہ سنی اور اس پر بہت تشدد کیا ۔ اس نے دانت چبا کر کہا کہ لے سُن ، اے شخص ! ہاں میں نے تجھے بیدار کیا تاکہ تو اپنے پیغمبرؐ کی اتباع میں نماز جماعت میں داخل ہو ۔ اگر تیری نماز کا وقت جاتا رہتا تو مارے درد و غم کے تیرے آنسوؤں کی شکلیں دونوں آنکھوں سے چھٹ جاتیں ۔ ہر شخص ایک نہ ایک قسم کی عبادت کا چسکار رکھتا ہے اس کے بغیر گھڑی بھر صبر نہیں کر سکتا وہ تیرا درد و غم سو نمازوں کے برابر ہوتا ۔ بھلا نمازیں اور اس فروتنی کی روشنی میں کیا نسبت اگر تمھاری نماز اس وقت فوت ہو جاتی تو اس پشیمانی کے درد سے تم آہ و فغاں کرتے ۔ وہ افسوس ، وہ آہ و زاری اور وہ فروتنی ، سو ذکر اور سو نمازوں پر سبقت لے جاتی ہیں تو حاسد ہوں ۔ میں نے اسی حسد سے تم کو بیدار کر دیا ۔ امیر معاویہؓ نے کہا کہ اب تو نے ٹھیک بات بتائی ۔ تیرا یہی کام ہے ۔ تو اسی کے لائق ہے ۔ تو مکڑی ہے مکھیوں کا شکار کرتا ہے ۔ مگر اے کُتّے میں مکھی نہیں ہوں میرے شکار کے لیے تکلیف نہ اُٹھا ۔ میں سفید باز ہوں مجھے بادشاہ ہی شکار کرتا ہے ۔ بھلا مکڑی میرے اطراف جالا کیوں کر تن سکتی ہے ۔ تو نے جو مجھے بیدار کیا سو وہ سُلانے کے لیے تھا اور تو نے جو کشتی دکھائی وہ گرداب تھا ۔ تو جو مجھے بھلائی کی طرف بلا رہا تھا وہ اس لیے تھا کہ مجھے افضل تر نیکی سے باز رکھے ۔



ایک شخص کا نمازِ جماعت کے نہ ملنے پر حسرت کرنا

ایک شخص مسجد میں داخل ہو رہا تھا ۔ دیکھا کہ لوگ باہر چلے آ رہے ہیں ۔ پوچھنے لگا کہ

جماعت ہو چکی جو لوگ مسجد سے باہر آ رہے ہیں۔ ایک نے کہا کہ حضرت پیغمبرؐ جماعت سے نماز ادا فرما چکے۔ ارے بے وقوف تو کہاں چلا حضرتؐ تو سلام پھیر چکے۔ اس نے جو ہائے کی تو دھواں باہر نکلنے لگا۔ اس کی آہ سے خونِ دل کی بو آنے لگی۔ یہ دیکھ کر کسی نمازی نے کہا کہ اے نماز کھونے والے اپنی یہ آہ تو مجھے بخش دے۔ میں نے اپنی نماز تجھے بخشی۔ اس نے کہا کہ آہ میں نے دی اور نماز قبول کی۔ اس شخص نے وہ آہ بڑے اعزاز سے لے لی اور بڑی فروتنی و رقّت کے ساتھ اپنے گھر واپس ہؤا۔ وہ باز تھا جسے تلاش نے شہباز بنا دیا۔ رات کو خواب میں آوازِ غیب آئی کہ تو نے آبِ حیواں خرید لیا۔ تیری اس خرید و بدل کے اعزاز میں ساری مخلوقات کی نماز مقبول ہوگئی۔

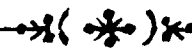


ایک چور کا صاحبِ خانہ سے ہاتھ چھڑا کر بھاگنا

ایک شخص نے گھر میں چور دیکھا اور اس کے پیچھے دوڑا یہاں تک کہ تھک کر پسینے پسینے ہو گیا۔ جب بھاگ دوڑ میں وہ اتنا قریب پہنچ گیا کہ اس کو پکڑ لے تو دوسرے چور نے پکارا کہ اجی میاں، یہاں آؤ یہ تو دیکھو بلا کے نشان یہاں ہیں۔ جلدی پلٹ کر آؤ۔ صاحبِ خانہ نے یہ آواز سُنی تو خوف زدہ ہؤا اور اپنے جی میں کہا کہ شاید ادھر کے چور نے کسی کو مار ڈالا یا وہ مجھ پر بھی پیچھے سے حملہ کرے گا۔ ممکن ہے میرے بال بچّوں پر ہاتھ ڈالے تو اس چور کے پکڑنے سے مجھے کیا فائدہ ہوگا۔ یہ سوچ کر پہلے چور کا پیچھا چھوڑ دیا اور پلٹ کر واپس آیا۔ کہا کہ اے مہربان کیا بات ہے، تم کیوں چیخ رہے تھے۔ وہ کہنے لگا کہ یہ دیکھیے چور کے پیروں کے نشان وہ بدذات چور ضرور ادھر ہی سے گیا ہے یہ اس کا کھوج موجود ہے بس اسی کو دیکھتے بھالتے اس کے پیچھے چلے جاؤ۔ صاحبِ خانہ نے کہا کہ ارے بے وقوف مجھے کھوج کیا بتاتا ہے میں نے تو اصل چور کو پکڑ ہی لیا تھا۔ تیری چیخ پکار سُن کر چھوڑا اور تجھ گدھے کو آدمی سمجھا۔ ارے احمق

یہ توکیا بیہودہ بکواس کرتا ہی، میں تو حقیقت کو پا چکا تھا، بھلا نشان کیا چیز ہی۔ یا تو تو بدمعاش ہی یا بے وقوف، بلکہ ممکن ہی کہ تو ہی چور ہو اور سب واقعہ تجھے معلوم ہو۔ میں تو اپنے دشمن پر قبضہ پا چکا تھا، تو نے اسے چھڑوا دیا یہ کہہ کر کہ دیکھو یہاں نشان ہی۔

امیر معاویہؓ کی حکایت کی طرح یہ دوسری تمثیل ہی کہ کس طرح آدمی کو ایک بہتری کا لالچ دے کر اصل بھلائی سے روکا جا سکتا ہی کہ فائدے کی بجائے وہ خسارے میں رہے ۔



منافقوں کا مسجدِ ضرار تعمیر کرنا

کج روی کی ایک اور مثال سنو، شاید تمھارے دل میں اترے۔ ایسی ایسی ٹیڑھی چالیں اہلِ نفاق حضرت رسول اللہ صلعم سے بھی چلتے تھے۔ کہتے تھے کہ آؤ دینِ احمدی کی عزت بلند کرنے کو ایک مسجد بنائیں اور درحقیقت وہ فریب کا گھر تھا۔ چنانچہ اُنھوں نے ایک مسجد کی تعمیر آغاز کی، فرش اور چھت تیار کر دی۔ سمتِ قبلہ درست کر دی۔ لیکن مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی جماعت میں پھوٹ پڑ جائے، حضرت پیغمبرؐ کے حضور میں خوشامدانہ آئے اور عرض کی کہ ای رسولِ خدا ازراہِ احسان اس مسجد تک قدم رنجہ فرمائیے تاکہ آپ کے قدموں کی برکت سے مسجد مبارک ہو جائے، اللہ تعالیٰ آپ کے نامِ پاک کو تا قیامت قائم رکھے۔ یہ مسجد دھوپ اور پانی سے بچاؤ کے لیے کارآمد ہی تاکہ مسافر وہاں آرام کی جگہ پائے۔

خدا کے رسول صلعم کے آگے جادوگری کیا کرنے لگے وہ اپنی ہاہمی اور جہالت کا گھوڑا دوڑانے لگے۔ چاپلوسی اور خوشامد کر کے چاہتے تھے کہ حضرت وہاں تشریف لائیں۔ وہ مہربان سراپا رحمت رسولؐ تھے کہ سوائے تبسم اور اچھا اچھا فرمانے کے کچھ

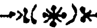
نہ کہتے تھے۔ آپ نے اس جماعت کی خوبیاں گنائیں اور درخواست کو قبول کرکے ان کا دل خوش کر دیا۔ باوجودیکہ ان کا مکر آپ پر دفعتہً اس طرح ظاہر ہو گیا تھا جس طرح کہ دودھ میں بال دکھائی دیتا ہے۔ اس بال سے قطع نظر کرکے آپ ان کے دودھ ہی کی تعریف فرماتے رہے۔ جب طے ہو گیا کہ حضرت رسولؐ اللہ وہاں تشریف لے چلیں تو غیرتِ حق نے آواز دی کہ ان فریبیوں کی بات نہ سنو۔ جو کچھ یہ ظاہر کرتے ہیں واقعہ اس کے برخلاف ہے۔ ان کا ارادہ سیہ روئی کے سوا کچھ نہ تھا بھلا آتش پرستوں اور یہودیوں نے دین داری کب پسند کی۔ انھوں نے دوزخ کے پل پر مسجد بنائی ہے اور خدا سے بھی مکر کھیلے ہیں۔ ان کا ارادہ تو اصحاب رسول صلعم میں تفرقہ ڈالنا ہے۔ پھر حضرت پیغمبر صلعم کو حکم ہوا کہ ان کی بے وفائی صاف صاف ظاہر کر دو۔ آپ نے فرمایا کہ اے بے وفا جماعت، چپ رہو۔ تم لوگ بد باطن اور دشمن ہو، میرا پیچھا چھوڑ دو۔ جب ان کے چند بھید کھولے تو ان کی ساری عمارت ڈھئی گئی۔ سارے ایلچی خدا نہ کرے، خدا نہ کرے کا دم بھرتے ہوئے واپس ہوئے۔ اس کے بعد ہر منافق قرآن بغل میں دبائے مکر سے حضرت پیغمبرؐ کے پاس لایا تاکہ قسمیں کھائیں کہ بات بات پر قسم کھانا بھی گمراہوں کی سنّت ہے۔ چونکہ گمراہ اپنے دین پر پختہ نہیں ہوتا اس لیے حرب بے ضرب بے قسم توڑ دیتا ہے۔

وہ لوگ نورِ وحی سے محروم تھے اس لیے قسموں پر قسمیں کھاتے رہے۔ چونکہ خدا نے سوگند کو سپر بنایا ہے اس لیے لڑنے والا سپر کیسے چھوڑ سکتا ہے۔ حضرت پیغمبر صلعم نے پھر بہ تکرار فرمایا کہ تم جھوٹے ہو۔ جب شہادتوں سے بھی ثابت ہو گیا کہ وہ مسجد نہ تھی بلکہ یہودیوں کے مکر و حیلہ تراشنے کی غرض سے ایک مکان تھا تو حضرت رسول صلعم نے حکم دیا کہ اس کو منہدم کرکے یہاں کوڑا کرکٹ ڈالا کرو

پس جاننا چاہیے کہ حقائق اصل اصول ہیں، وہاں بھی ایک سے دوسرے میں

فرق و فصل ہے۔

اے صاحبِ عمل، اپنی کردار کو کسوٹی پر کس کر دیکھ، کہیں تو بھی مسجدِ ضرار نہ تعمیر کر رہا ہو۔ اس مسجد بنانے والوں کا تو خوب تمسخر کیا مگر جب اپنے عمل پر نظر ڈالی تو خود بھی ان ہی میں سے نکلا۔



چار ہندوستانیوں کا نماز میں بات کرنا

چار ہندوستانی ایک مسجد میں داخل ہوئے اور نماز پڑھنے لگے۔ ہر ایک نے الگ الگ تکبیر کہی اور بہت انکسار و سوزِ درونی سے نماز میں مصروف ہوا۔ جب مؤذن آیا تو ان میں سے ایک کے منہ سے نکل گیا کہ اے مؤذن اذان بھی دی؟ ابھی وقت ہے۔ دوسرے نے بہت عاجزی سے کہا، تم نے نماز میں بات کی بس نماز باطل ہوئی۔ تیسرے نے دوسرے سے کہا کہ ارے عقل کے اندھے! اسے طعنہ کیا دیتا ہے ذرا اپنے کو تو دیکھ چوتھے نے کہا کہ الحمد للہ کہ میں تم تینوں کی طرح کنوئیں میں نہیں گرا۔ اس طرح چاروں کی نماز جاتی رہی۔

دوسروں کے عیب پر نظر رکھنے والے اکثر گمراہ ہو جاتے ہیں۔ سعادت والا وہ ہے جس نے اپنا عیب دیکھا اور کسی نے دوسرے کا عیب بیان کیا تو اُسے بھی اپنے ہی سے منسوب کیا کیونکہ اگر ایسا عیب تجھ میں نہیں ہے تو بھی بے فکر مت ہو۔ ممکن ہے کہ آیندہ اسی قسم کا عیب تجھ میں ظاہر ہو جائے۔



ڈاکوؤں کا دو شخصوں میں سے ایک کو مار ڈالنے کا قصد کرنا

کسی جگہ ڈاکو بڑے خوں ریز تھے ایک گانو پر ڈاکہ زنی کے لیے آ پڑے۔ اس گانو کے مال داروں میں سے دو شخصوں کو پکڑ کر ایک کی گردن مارنے پر تیار ہوئے۔ اس کے ہاتھ باندھ دیے کہ گلا کاٹ ڈالیں۔ اس نے پوچھا کہ ای بادشا ہو، اور ای بڑھیا امیرو! آخر میرے ہی خون کا ارادہ کیوں کرتے ہو، کیا میرے ہی خون کے پیاسے ہو۔ میرے مار ڈالنے کی غرض اور حکمت کیا ہی، میں تو مرد فقیر اور ننگا ہوں۔ ڈاکوؤں نے کہا، تجھے مار ڈالنے میں حکمت یہ ہی کہ تیرے ساتھی پر ہماری ہیبت طاری ہو اور جان کے ڈر سے دولت کی نشاں دہی کرے۔ اس نے کہا کہ وہ تو مجھ سے بھی زیادہ محتاج ہی، ایک تُرک نے کہا کہ ہم کو گمان ہی کہ وہ دولت مند ہی۔ اس نے کہا کہ جب تم کو شک ہی کہ ہم دونوں دولت مند ہیں تو اوّل دوسرے گرفتار کو قتل کرو تاکہ میں ڈر کر دولت کی نشاں دہی کروں۔

خدا کی بخششوں کو دیکھ کہ ہم دَورِ آخر کی انتہا پر دنیا میں آئے۔ قومِ نوح اور قومِ ہود کی ہلاکت کی عبرتیں رحمت کے منادی نے ہم پر کھول کر بیان کردیں۔ ان کو اس لیے مار ڈالا کہ تو ڈرے اور اگر اس کے برعکس ہوتا تو تیرا کہاں ٹھکانا لگتا +



ایک بڈھے کا طبیب سے شکایتِ مرض کرنا اور طبیب کا جواب دینا

ایک بوڑھے شخص نے طبیب سے کہا کہ میں ضعفِ دماغ میں مبتلا رہتا ہوں۔ طبیب نے کہا کہ یہ ضعفِ دماغ بُڑھاپے کے سبب سے ہی۔ پھر اُس نے کہا کہ میری آنکھ میں دُھندلاپن آگیا ہی۔ طبیب نے جواب دیا کہ ای مردِ بزرگ! یہ بھی بڑھاپے

سے ہے۔ اس نے کہا کہ میری کمر میں درد رہتا ہے۔ طبیب نے کہا یہ بھی بڑھاپے کی وجہ سے ہے۔ پھر اس نے شکایت کی کہ کھانا ہضم نہیں ہوتا، طبیب نے کہا کہ ضعفِ معدہ بھی بڑھاپے کی علامت ہے۔ پھر بوڑھے نے کہا کہ میرا سانس رُک کر چلتا ہے۔ طبیب نے کہا کہ ہاں جب بڑھاپا آتا ہے تو سو بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں یہاں تک کہ سانس بھی رُک جاتا ہے۔ پھر اس نے کہا کہ میرے پانو بے کار ہو گئے چلا نہیں جاتا، طبیب نے کہا کہ اس بڑھاپے نے تجھے گوشہ نشین کر دیا۔ اس نے کہا کہ میری کمر دُہری ہو گئی، اس نے جواب دیا کہ یہ بھی ضعیفی سے ہوئی ہے۔ آخر کار (جھنجلا کر) بوڑھے نے کہا کہ ای احمق تو ایک ہی بات رٹے جاتا ہے! کیا فنِ طبابت میں تو نے بس یہی سیکھا ہے۔ ارے بد دماغ! خدا نے ہر درد کی دوا مقرر کی ہے۔ تو احمق گدھا اپنی ناواقفیت کی وجہ سے زمین پر پڑا لوٹ رہا ہے۔ پس طبیب نے جواب دیا کہ ای پیرِ فرتوت! یہ تیرا غصّہ بھی بڑھاپے کے سبب ہے۔ جب سب اجزا و اعضا کم زور ہو گئے تو صبر و ضبط کی قوّت بھی کم ہو گئی۔ جسے بات کی برداشت نہیں ہوتی وہ گرم آواز نکالتا ہے اور جو ایک گھونٹ بچا نہیں سکتا اسے قے ہو جاتی ہے۔ ہاں۔ مگر وہ بوڑھا جو حق کا متوالا ہے اس کے اندر پاک زندگی ہے ایسا شخص ظاہر میں بوڑھا اور باطن میں بچہ ہے، ولی و نبی کیسے ہوتے ہیں؟ ـــــ ایسے ہی ہوتے ہیں +



ایک لڑکے کا اپنے باپ کا ماتم کرنا اور مسخرے کی اس پہ رائے زنی

ایک لڑکا اپنے باپ کے تابوت پر پھوٹ پھوٹ کر روتا اور سر پیٹتا تھا، کہ ای بابا جان! یہ لوگ تمھیں کہاں لے جا رہے ہیں۔ یہ تمھیں ایک تنگ و تاریک گڑھے میں ڈالیں گے جہاں نہ قالین ہے نہ بوریا ہے۔ نہ وہاں رات کو چراغ ہے نہ کھانے کا نام و نشان ہے۔ نہ اس کا در بند ہے نہ کھلا اور نہ وہاں کوئی ہمسایہ ہے جو پشت پناہی کرے۔ آپ کا جسم جو بوسہ گاہِ خلق

تھا، تاریک و سیاہ گھر میں کیوں کر رہے گا۔ ایسا گھر جو بالکل تنگ اور قابل رہنے کے نہیں جس میں چہرے کا رنگ روغن سب جاتا رہتا ہے۔ اسی طرح قبر کی علامات بیان کرتا جاتا تھا اور اشکِ خوں اس کی آنکھوں سے ٹپکتے جاتے تھے۔ ایک مسخرے نے یہ بین سُن کر اپنے باپ سے کہا، باوا جان، خدا کی قسم، معلوم تو یہ ہوتا ہے کہ اس میت کو ہمارے گھر لے جا رہے ہیں۔ باپ نے مسخرے سے کہا کہ ہائیں۔ ارے احمق یہ کیا بے موقع باتیں کرتا ہے، مسخرے نے جواب دیا کہ حضرت انشانیاں جو اس نے بیان کی ہیں وہ تو سنو! یہ نشانیاں جو اس نے ایک ایک کرکے گنی ہیں، وہ یقیناً سب کی سب ہمارے گھر کی ہیں۔ ہمارے گھر میں بھی نہ بوریا ہے نہ چراغ ہے، نہ کھانا ہے اور نہ اس کے دروازہ ہے، نہ صحن ہے نہ کوٹھا۔

اس طرح کی قابلِ عبرت نشانیاں لوگوں کے اپنے حال میں موجود ہیں۔ مگر وہ سرکشی سے انھیں کب دیکھتے ہیں۔ وہ دل جن میں خدا کی کبریائی کی کرن نہیں پہنچی، آتش پرستوں کی جان کی طرح تاریک ہیں۔ تیرے ایسے دل سے تو قبر بہتر ہے۔ اے شخص اپنے دل کی قبر سے باہر آ ۔



اعرابی جس نے وزن کی خاطر گونی میں ریت بھرلی تھی

اے بات ماننے والے! بھولے پن اور کچے پیسے پن کی ایک کہانی سن۔ ایک اعرابی نے اونٹ پر ایک گونی اناج کی بھری اور دوسری گونی میں ریت بھر کر اونٹ پر لاد دیا اور خود ان دونوں کے اوپر ہو بیٹھا۔ راستے میں ایک باتونی صاحب ملے اور ہمدردی سے سفر کی حضر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر پوچھا کہ کیوں میاں! دونوں گونیوں میں کیا بھرا ہوا ہے؟ اعرابی نے کہا کہ میری ایک گونی میں تو گیہوں ہیں اور دوسری میں ریت بھری ہے۔

پوچھا کہ آخر تو نے اس گونی کو بھرا ہی کیوں؟ جواب دیا تاکہ دونوں طرف گونیاں ہم وزن رہیں اور وزن صرف ایک ہی طرف نہ رہے۔ بولے گونی میں آدھے گیہوں نکال کر دوسری گونی میں پاسنگ کے طور پر ڈال دے، دونوں طرف وزن برابر ہو جائے گا اور اونٹ پر بھی بوجھ نہ رہے گا۔ اعرابی نے کہا کہ شاباش اے صاحبِ ہنر! ایسی عمدہ عقل اور اچھی رائے کے باوجود تو جنگل میں بے سروسامان پیادہ سفر کر رہا ہے۔ اعرابی کو اس پر رحم آیا اور ارادہ کیا کہ اس کو بھی اونٹ پر بٹھا لے پھر پوچھا کہ اے خوش گفتار حکیم! آپ کس حال میں ہیں بیان تو کیجیے۔ ایسی دانائی اور خوش تدبیری جو آپ میں ہے، ہو نہ ہو آپ یا کہیں کے امیر یا وزیر ہیں۔ نصیحت کرنے کہا کہ میں تو نہ حاکم ہوں نہ وزیر بلکہ مسکین ہوں چنانچہ میری ظاہری حالت اور میرا لباس اس کا گواہ ہے۔ اعرابی نے پوچھا کہ آپ کے پاس کتنے اونٹ اور کتنی گائیں ہیں۔ جواب دیا کہ نہ یہ ہے نہ وہ ہے۔ پھر اعرابی نے پوچھا کہ آپ کیا کاروبار کرتے ہیں، کیا دوکانداری کرتے ہیں؟ کہا نہ ہمارا کہیں ٹھکانا ہے اور نہ کوئی دکان ہے۔ اعرابی نے کہا پھر نقد و جنس گھر میں ہوگی۔ تمام عالم تانبا ہے اور اس کی کیمیا آپ کے پاس ہے کیونکہ عقل و دانش کے موتی ڈھیروں آپ کے پاس ہیں۔ غالبًا آپ کے گھر میں خزانوں کے خزانے ہوں گے ناصح نے کہا کہ واللہ اے امیرِ عرب! ملکیت میں تو ایک شب کی خوراک بھی نہیں۔ میں تو ننگے پاؤں ننگے بدن چل رہا ہوں تاکہ جو روٹی دے اس کا ہو رہوں۔ مجھے اس حکمت اور فضل و ہنر سے خیال پکانے اور دردِ سر کے سوا اور کچھ حاصل نہیں۔ یہ سن کر عرب نے جھڑک کر کہا کہ چل دور ہو، میرے پاس سے سرک، کہیں تیری بدنصیبی مجھ پر نہ آجائے۔ اپنی اس بدنصیبی کی دانائی کو دور لے جا، تیری باتیں اہلِ دنیا پر افلاس لانے والی ہیں۔

ایک شخص کا دعویٰ کہ خدا گناہ پر میری گرفت نہیں کرتا اور حضرت شعیبؑ کا جواب

حضرت شعیبؑ کے زمانے میں ایک شخص کہا کرتا تھا کہ خدا نے میرے ان گنت عیب دیکھے ہیں، اوہو! کس قدر گناہ اور جرم دیکھے ہیں لیکن اپنے کرم کی وجہ سے میری گرفت نہیں فرماتا۔ حق تعالیٰ نے غیبی آواز سے حضرت شعیبؑ سے بطور جواب کے فرمایا کہ اے شخص تو سیدھا راستہ ترک کر کے جنگل میں بھٹک گیا ہے، تو کہتا ہے کہ میں تیرے گناہوں پر گرفت نہیں کرتا حالانکہ میں تیری اس قدر گرفت کرتا رہتا ہوں کہ تو سر سے پاؤں تک زنجیروں میں گٹھا ہوا ہے مگر تجھے خبر نہیں۔ اے سیاہ دیگ تیرا زنگ تجھی پر چڑھ رہا ہے اور اس نے تیری روح کے ماتھے کو بے نور کر دیا ہے۔ تیرے دل پر زنگ کی تہیں اس قدر چڑھ گئی ہیں کہ خدا کے بھیدوں کو دیکھنے سے تو اندھا ہو گیا ہے۔ لوہار جب زنگی ہو تو دھنواں اس کے چہرے کے ہم رنگ ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی رومی لوہاری کا پیشہ کرے تو اس کا چہرہ دھنوئیں سے چست کبرا ہو جاتا ہے۔ ایسا آدمی گناہ کی تاثیر جان جاتا ہے اور گڑگڑا کر توبہ کرنے لگتا ہے۔ جو آدمی بُرائی کرے اور اس پر اڑ جائے تو اس کی سمجھ پر خاک پڑ جاتی ہے۔ وہ کبھی توبہ نہیں کرتا یہاں تک کہ گناہ اس کے دل کو بھا جاتا ہے اور وہ شخص بے دین ہو جاتا ہے۔ اس میں شرم و ندامت کا مادّہ نہیں رہتا اور وہ ساٹھ تہوں کا زنگ اس کے آئینے پر چھا جاتا ہے حتیٰ کہ اس کے لوہے کو بھی زنگ کا مورچہ کھانے لگتا ہے۔

جب حضرت شعیبؑ نے یہ نکتے اس سے کہے تو اس کے دل میں چند لطائف کھلے۔ چونکہ اس کی جان بھی وحیِ آسمانی سُن رہی تھی، اس لیے اس نے کہا کہ اگر خدا میری گرفت کرتا تو میرا نام و نشان کیسے رہتا۔ حضرت شعیبؑ نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کی کہ بارِ الٰہا یہ میری تردید کر رہا ہے اور آپ کی گرفت کا علانیہ ثبوت مانگتا ہے۔ حق تعالیٰ سے جواب ملا کہ میں عیب چھپانے والا ہوں، اس کے سب راز نہ کہوں گا البتہ اس کی گرفتاری کی ایک

علامت بتاتا ہوں ۔ وہ یہ کہ وہ روزے رکھتا ہے، دعائیں کرتا ہے، نماز پڑھتا ہے، زکوٰۃ دیتا ہے وغیرہ وغیرہ لیکن اس کی جان کو ان عبادتوں سے ذرا سی بھی لذت نہیں ملتی ۔ وہ بہت سی عبادتیں اور نیک عمل کرتا ہے لیکن اس کو مزا نہیں آتا۔ اس کی عبادت ظاہر میں پاک ہوتی ہے لیکن باطن میں پاک نہیں جیسے درخت میں اخروٹ تو بہت سے لگے ہوں مگر ان میں مغز نہ ہو۔ ذوق چاہیے تاکہ عبادت کا پھل ملے اور پھل میں مغز چاہیے تاکہ اس سے درخت پیدا ہو۔ جس طرح بے گودے کا بیج درخت نہیں بن سکتا اسی طرح بے جان صورت محض خیال ہوتی ہے۔ جب حضرت شعیبؑ نے یہ نکتے اس کو سنائے تو سوچ ہی سوچ میں گدھے کی طرح کیچڑ میں پھنسا کا پھنسا رہ گیا +



ایک چوہے کا اونٹ کی نکیل کھینچنا

ایک چوہے کے ہاتھ اونٹ کی نکیل لگ گئی وہ بڑی شان سے کھینچتا ہوا چلا۔ اونٹ جو تیزی سے اس کے ساتھ چلا تو چوہے کے سر میں یہ ہوا سمائی کہ میں بھی پہلوان ہوں ۔ اس کے خیال کی جھلک اونٹ پر پڑی تو اس نے کہا اچھا تجھے اس کا مزا چکھاؤں گا ۔ چلتے چلتے ایک بڑی ندی کے کنارے پہنچے جہاں ہاتھی بھی ڈوب جائے ۔ چوہا وہاں ٹھٹک کر سرد ہو گیا ۔ اونٹ نے کہا، اے جنگلوں پہاڑوں کے ساتھی ! تم کیوں رک گئے اور یہ حیرانی کیوں ہے۔ آؤ مردانگی کے ساتھ ندی میں اترو۔ تم تو سردار اور آگے آگے چلنے والے ہو، بیچ رستے میں ٹھیر کر ہمت نہ ہارو۔ چوہے نے کہا، اس پانی کا پاٹ تو بہت چوڑا ہے مجھے اس میں ڈوب جانے کا خوف ہے۔ اونٹ نے کہا اچھا میں دیکھوں پانی کتنا گہرا ہے یہ کہہ کر ندی میں قدم رکھا اور کہا ارے اندھے چوہے ! اس میں تو صرف زانو تک پانی ہے تو اس قدر حیران و پریشان کیوں ہو گیا۔ چوہے نے کہا کہ جو چیز تیرے آگے

چیونٹی ہی وہ ہمارے لیے اژدہا ہی کیوں کہ زانو زانو میں بہت فرق ہی۔ اگر پانی تیرے زانو تک ہی تو میرے سر سے گزوں اونچا ہی۔ اس وقت اونٹ نے کہا کہ خبردار دوبارہ ایسی گستاخی نہ کرنا کہیں تیرا جسم و جان اس آگ میں نہ جل جائے۔ اپنے جیسے چوہوں کے آگے تم جیسی چاہے شیخی بگھار لو مگر اونٹ کے آگے چوہا زبان نہیں ہلا سکتا۔ چوہے نے کہا کہ میں توبہ کرتا ہوں، خدا کے واسطے اس خطرناک پانی سے میری جان چھڑا۔ اونٹ کو رحم آیا اور کہا اچھا چڑھ جا اور میرے کوہان پہ بیٹھ جا۔ اس طرح وار پار ہونا میرا کام ہی تجھ جیسے ہزاروں کو ندی پار کرا دوں گا۔

جب تو پیمبر نہیں تو مقررہ راستے سے چل تاکہ کنویں سے نکل کر ایک روز دولت و ثروت پہ پہنچے۔ جب تو سلطان نہیں ہی تو رعیت بن کے رہ اور جب تو کشتی بان نہیں تو کشتی نہ چلا۔ تانبے کی طرح اکسیر کی خدمت کر، ای دل تو دل دار کے مزاج اُٹھا۔ وہ دل دار کون ہیں، صاحبانِ دل ہیں جو آدمی کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتے ہیں ٭



ایک بڑے پیٹے صوفی کو صوفیوں کا بُرا بھلا کہنا

ایک صوفی کو تمام صوفی بُرا بھلا کہتے ہوئے شیخ کے پاس آئے اور عرض کی کہ ای پیشوا تو ہم میں اور اس میں انصاف کر۔ پوچھا کہ آخر تمھارا الزام اس پہ کیا ہی؟ اُنھوں نے کہا کہ اس میں تین خصلتیں بہت بُری ہیں۔ ایک یہ کہ یہ باتونی اس قدر ہی جیسے چلتے ہوئے قافلے کا گھنٹا، دوسرے یہ کہ یہ بیس آدمیوں کی خوراک سے زیادہ ہڑپ کر جاتا ہی اور جب سونے پہ آتا ہی تو اصحابِ کہف کی طرح سوئے جاتا ہی اُٹھنے کا نام نہیں لیتا۔ یہ تین شکایتیں صوفیوں نے نون مرچ لگا کر کیں۔ شیخ

نے فقیر سے کہا کہ ہر حال میں میانہ روی اختیار کر۔ حدیث میں ہے بیچ راہ کے کام نیک ہوتے ہیں۔

جب صوفی کے جواب کی نوبت آئی تو اس نے عرض کی کہ اگرچہ بیچوں بیچ کا راستہ اختیار کرنا دانائی ہے لیکن بیچ بھی ایک نسبت سے قرار پاتا ہے چنانچہ ندی کا پانی اونٹ کی نسبت سے کم ہے لیکن چوہے کو وہی دریا کے برابر ہے۔ جس کا راتب چار روٹیوں کا ہو اگر وہ دو یا تین کھائے تو درمیانی مقدار ہے۔ اگر وہ پوری چار روٹیاں کھالے تو وہ درمیانی مقدار نہیں رہی، اور جس کی بھوک دس روٹیوں سے پوری ہو اگر وہ چھے روٹیاں کھائے تو سمجھو کہ اس نے درمیانی مقدار کھائی۔ میری پچاس روٹیوں کی خوراک ہے اور تجھ سے چھے روٹیاں بھی نہیں چلتیں۔ تو دس رکعت نماز میں تھک جاتا ہے اور میں پانسو رکعت پر بھی نہیں تھکتا۔ اسی طرح تو اپنی کمزوری پر مجھے نہ جانچ۔ جو چیز تیرے لیے رات ہے میرے حق میں وہی صبح کا سویرا ہوتا ہے۔



بادشاہ کا ایک درخت کی تلاش کرنا کہ جو اس کا میوہ کھائے وہ کبھی نہ مرے

ایک عقل مند نے قصّے کے طور پر بیان کیا کہ ہندوستان میں ایک درخت ہے جو کوئی اس کا پھل کھائے تو نہ کبھی وہ بوڑھا ہو نہ کبھی مرے۔ ایک بادشاہ نے سُن کر یقین کرلیا اور اس درخت اور اس کے پھل کا مشتاق ہوگیا۔ اپنے وزیروں میں سے ایک عقل مند کو قاصد بناکر اس درخت کی تلاش میں ہندوستان بھیجا۔ وہ شہر شہر پھرا بلکہ نہ کوئی جزیرہ چھوڑا نہ پہاڑ نہ جنگل جس سے اس نے درخت کا پتا پوچھا اُسی نے ہنسی اُڑائی اور کہہ دیا کہ ایسی تلاش تو سوائے پاگل کے اور کوئی نہیں کرے گا۔ وہ ہر شخص سے برخلاف بات سُنتا تھا مگر اپنی دُھن چھوڑتا نہ تھا۔ برسوں ہندوستان

میں سفر کرتا رہا اور بادشاہ اس کو اخراجات بھیجتا رہا۔ جب مسافرت کی تکلیف حد سے گزری تو آخرکار درخت کی تلاش سے تنگ آ گیا کیوں کہ درخت کا پتا نشان کہیں نہ ملا اور مقصود کی اصلیت سوائے خبر یا روایت کے اور کچھ ثابت نہ ہوئی۔ اس کی امید کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اور جس قدر ڈھونڈا تھا وہ سب نہ ڈھونڈنے کے برابر ہو گیا۔ مجبور اور مایوس ہو کر واپس چلا تو روتا جاتا تھا اور راستہ طے کرتا جاتا تھا۔ راستے کی ایک منزل میں کوئی شیخ بڑا عالم اور قطبِ وقت رہتا تھا۔ یہ دل شکستہ اس کی خدمت میں حاضر ہؤا اور سوچا میں ہر طرف سے مایوس ہو کر اس کے پاس جاؤں ممکن ہی کہ سیدھے راستے پر لگ جاؤں۔ چونکہ میں اپنے مطلب سے ناامید ہوں شاید کہ اس کی دعا میرے ہم راہ ہو جائے۔ الغرض وہ ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں سے شیخ کی خدمت میں حاضر ہؤا اور برستے بادل کی طرح اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ عرض کی کہ یا حضرت یہ وقت رحم اور مہربانی کا ہی میں بالکل ناامید ہوں بس یہی گھڑی بخشش کی ہی۔ شیخ نے کہا کہ بات کو اچھی طرح کھول کر کہو کہ ناامیدی کس سبب سے ہی، تیرا مطلب کیا تھا اور تیری دُھن اب کیا ہی۔ جواب میں عرض کی کہ بادشاہ نے مجھے ایک درخت کی دریافت پر مقرر کیا تھا کہ جس کا پھل آبِ حیات کا حکم رکھتا ہی۔ میں نے اس کو برسوں ڈھونڈا مگر سوائے ہمہ شما کے طعنوں کے اس کا کہیں پتا نہ ملا۔ یہ سُن کر شیخ بہت ہنسا اور کہا کہ بھلے مانس! یہ درخت علم کا ہی۔ تو درخت کی ظاہری صورت کا گمان کر گیا اس لیے شاخ معنی سے بےنصیب رہا کہیں اس کا نام درخت ہو جاتا ہی، کہیں سورج ہو جاتا ہی، کبھی اسی کا نام سمندر ہو جاتا ہی اور کبھی بادل۔ اُس کی ہزارہا صفات ہیں انھیں میں سے ایک صفت بقائے دوام ہی۔ اے جوان! تو صورت کو کیا ڈھونڈتا ہی اس کے معانی کی تلاش کر۔ صورت ظاہر تو چھلکا ہی اور معنی اس پھل کا گودا۔ نام کو چھوڑ اور گُن (صفت) کو دیکھ تاکہ گُن سے تجھے ذات کی رہنمائی

ہو۔ نام ہی سے مخلوقات کے آپس میں اختلاف پیدا ہوا ہے، جہاں معنی پر پہنچے کہ اختلاف جاتا رہا۔ اسی مضمون پر ایک دلچسپ مثال سُن تاکہ تو ناموں ہی ناموں میں نہ اٹکا رہ جائے +



زبان نہ جاننے کی وجہ سے انگور پر چار آدمیوں کا آپس میں جھگڑا

چار آدمی چار ملکوں کے ایک جگہ جمع تھے، کسی نے ان چاروں کو ایک درم (چاندی کا سکہ) دے دیا۔ ان میں ایک ایرانی تھا، ایک تُرک، ایک رومی اور ایک عرب۔ وہ چاروں اس کے خرچ کرنے میں جھگڑنے لگے۔ ایرانی نے کہا کہ یہ جھگڑا کسی طرح طے ہو، آؤ اس درم کے انگور خرید لیں، عرب نے کہا کہ خدا کی قسم، ہرگز نہیں، میں انگور نہ لوں گا، میں تو عنب لوں گا۔ وہ جو تُرک تھا، اُس نے کہا اے بدمعاش! مجھے عنب نہیں چاہیے میں تو اوزم لوں گا۔ رومی (اطالوی) نے تینوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ ان باتوں کو چھوڑو، ہم تو استافیل کھائیں گے۔ چونکہ ناموں کے معنی سے ناواقف تھے اس لیے آپس میں لڑنے لگے اور مار پیٹ کی نوبت پہنچی کیوں کہ جہالت غالب اور عقل سے خالی تھے۔ اس موقع پر اگر کوئی ملنسار ناموں کے بھید جاننے والا وہاں ہوتا تو ان میں صلح کرا دیتا۔ وہ کہتا کہ لاؤ، میں اسی ایک درم سے تم سب کی مطلوبہ چیز خریدتا ہوں۔ اگر تم شک وشبہ چھوڑ کر اپنا دل مجھے سونپ دو تو یہی ایک درم تم چاروں کے کام آجائے۔ تمھارا ایک چار ہو جائے گا اور چار دشمنوں کو ملا کر ایک کر دے گا +



تپتے بیابان میں ایک شیخ کا نماز پڑھنا اور اہل کاروان کا حیران رہ جانا

ایک چٹیل میدان میں ایک زاہد خدا کی عبادت میں مصروف تھا۔ مختلف شہروں سے حاجیوں کا قافلہ جو وہاں پہنچا تو ان کی نظر اس زاہد پر پڑی۔ دیکھا کہ سارا میدان خشک پڑا ہے مگر وہ زاہد اس ریت پر جس کے بھپکے سے دیگ کا پانی اُبلنے لگے نماز کی نیت باندھے اس طرح کھڑے تھے جیسے کوئی پھلواڑی یا ہری بھری دوب میں پہنچ کر مست ہو جاتا ہے۔ وہ نماز میں اپنے پیارے سے راز کی باتیں کرتا ہوا گہری فکر میں کھڑا تھا۔ حاجیوں کی جماعت بڑے ادب کے ساتھ اس فقیر کے نماز سے فارغ ہونے تک کھڑی رہی۔ جب وہ فقیر اپنی گہرائیوں میں ڈوب کر اُبھرا تو لوگوں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ اور چہرے سے پانی ٹپک رہا تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے کپڑے وضو سے بھیگ گئے ہیں۔ حاجیوں نے پوچھا کہ یہ پانی کہاں سے آیا؟ اس نے ہاتھ اُٹھا کر کہا کہ یہ سب اُوپر سے ہے۔ پھر پوچھا کہ آیا یہ پانی جب تم چاہتے ہو مل جاتا ہے یا کبھی دعا قبول ہو جاتی ہے اور کبھی رد ہو جاتی ہے۔ اے سلطان دین ہماری مشکل کو حل کر تاکہ تیرے حال سے ہمارا یقین بڑھے اور ہم جو اسباب کی پُوجا کرتے ہیں، اس بُت پرستی سے نجات پائیں۔ زاہد نے آسمان کی طرف آنکھیں اُٹھائیں اور کہا کہ اے باری تعالیٰ! ان حاجیوں کی دعا کو قبول کر۔ چونکہ تو نے بلندی سے مجھ پر دروازہ کھولا ہے اس لیے میں بلندی ہی سے اپنا رزق طلب کرنے کا عادی ہو گیا ہوں۔

زاہد ابھی مناجات کر ہی رہا تھا کہ دیکھتے کیا ہیں، ایک بادل کا ٹکڑا پانی ڈھونے والے ہاتھی کی طرح سروں پر چھا گیا اور پانی مشکوں اور پکھالوں برسنے لگا۔ بادل تو مشکوں برس رہا تھا اور پیاسے حاجی اپنی اپنی مشکیں بھر رہے تھے۔ اس بیابان میں یہ کرامت دیکھ کر حاجیوں میں سے ایک گروہ نے اپنے دل کے جنیؤ توڑ ڈالے۔ دوسری جماعت کا

ان عجائبات سے خدا کی قدرت اور اہل اللہ کی قوت پر یقین بڑھ گیا۔ تیسری جماعت منکروں کی تھی وہ کچے پھل کی طرح کھٹے کے کھٹے ہی رہے اور ہمیشہ کے لیے ناقص رہ گئے۔



دفترِ سوم

حضرت بلالؓ کا حیؔ کو "ہیؔ" کہنا

اگر تیری گفتار ٹیڑھی ہو اور معنی سیدھے ہوں تو وہ ٹیڑھا پن مقبولِ خدا ہے۔ اگر معنی ٹیڑھے اور لفظ اچھے ہوں تو ایسے معنی کسی کام کے نہیں۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا تلفظ ٹھیک نہ تھا اور وہ اذان دیتے وقت حَیّ کو ہَیّ پڑھتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض لوگوں نے عرض کی کہ اے پیغمبر ایسی ابتدا اسلام میں ٹھیک نہیں۔ ایک موذّن جس کا لب ولہجہ درست ہو اس کام پر مقرر فرمائیے۔ دین کے آغاز میں "حیّ علے الفلاح" کا غلط تلفظ کرنا عیب ہے۔ حضرت پیغمبرؐ کا غصّہ تیز ہوگیا اور آپ نے ایک دو نکتے علم لدنی سے ارشاد فرمائے۔ کہ اے نالائقو! خدا کے نزدیک بلالؓ کا ہیّ کہنا تمھارے سو دفعہ حَیّ حَیّ کہنے اور قیل وقال کرنے سے بہتر ہے۔ مجھے زیادہ ناراض نہ کرو کہیں تمھارے سب راز اوّل سے آخر تک کھول کر نہ رکھ دوں۔



خدا کا موسیٰؑ کو حکم دینا کہ مجھ کو اس مُنہ سے بلا کہ جس سے کبھی گناہ نہ کیا ہو

اگر تو دعا کے وقت ذکرِ الٰہی میں مشغول نہیں رہتا تو جا صاف باطن لوگوں سے دعا کروا۔ اسی واسطے حضرت موسیٰؑ سے خدا نے فرمایا کہ اے کلیم اللہ! ایسے منہ سے میری مدد طلب کر جس سے تو نے کوئی گناہ نہ کیا ہو۔ موسیٰؑ نے کہا کہ میرا ایسا منہ کہاں تو حکم ہوا

کہ دوسروں کے منہ سے دعا کروا کیوں کہ تو نے دوسرے کے منہ سے کوئی گناہ نہیں کیا جس منہ سے تو نے کبھی گناہ نہیں کیا وہ دوسرے ہی کا منہ ہوسکتا ہے۔ تو ایسا عمل اختیار کر کہ بہت سے منہ تیرے واسطے دن رات دعا میں مصروف رہیں۔ اگر یہ ممکن نہیں تو اپنے منہ کو پاک کر اور اپنی روح کو جگا۔ خدا کا ذکر پاک ہے جہاں پاکی داخل ہوتی ہے وہاں سے ناپاکی دور ہوجاتی ہے۔ ہر چیز اپنی ضد سے بھاگتی ہے چنانچہ جب اُجالا ہوتا ہے تو رات غائب ہوجاتی ہے۔ جب نامِ پاک منہ پر چڑھ جاتا ہے تو نہ وہ پہلا منہ رہتا ہے نہ پلیدی رہتی ہے +



بندۂ عاجز کا اللہ اللہ کرنا ہی عین خدا کا جواب دینا ہے

ایک شخص رات کو اللہ اللہ کر رہا تھا تاکہ ذکر سے اس کے ہونٹ شیریں ہوجائیں۔ شیطان نے اس سے کہا کہ ابے گنٹھل! چپ، کب تک بکواس کرتا رہے گا۔ یہ جو اللہ اللہ کی رٹ لگائی ہے تو کبھی اُدھر سے جواب بھی پایا۔ جب وہاں کوئی سنائی نہیں ہوتی تو اس مردنی صورت سے تو کب تک اللہ اللہ پکارتا رہے گا۔

وہ بہت شکستہ دل ہوا، سر جھکایا تو نیند آگئی۔ دیکھتا کیا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام تشریف رکھتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ ارے تو نے ذکر کیوں چھوڑ دیا، کیا تو اس ذکر سے پشیمان ہوگیا؟ اس نے جواب میں عرض کی کہ مجھے ہاں کا جواب نہیں ملتا اس لیے فکرمند ہوں کہ کہیں بارگاہ کا دروازہ مجھ پر بند تو نہیں ہوگیا۔ خضرؑ نے کہا کہ مجھ سے خدا نے ارشاد کیا ہے کہ تجھ سے کہ دوں کہ اے فریب خوردہ! تو جو اللہ کا ذکر کرتا ہے، وہ ہماری صدائے لبیک[۱] ہی تو ہے، اور وہ عجز و سوز و درد جو تیرے دل میں پیدا ہوتا ہے وہ

۱؎ لبیک = یعنی حاضر ہوں۔ جیسے کسی کے پکارنے پر "جی حاضر" کہا جائے۔

ہمارا فرستادہ ہوتا ہی۔ کیا میں نے ہی تجھے اپنے کام پر نہیں لگایا۔ اور کیا میں نے ہی تجھ کو اپنے ذکر میں مشغول نہیں کیا تیرا خوفِ خدا اور تیرا عشقِ خدا ہماری عنایت کی کمند ہی اور تو جو یا رب کہتا ہی تو ہر یارب میں ان گنت لبّیکیں چھپی ہوئی ہیں۔ جاہل کی جان اس پکار سے دور رہتی ہی کیوں کہ وہاں یارب کہنے کا دستور نہیں۔ اس کے منہ اور دل پر قفل لگے ہیں تاکہ تکلیف کے وقت یا خدا کہہ کے نہ روئے۔



دیہاتی کا شہری کو تصنّع سے دوست بنانا

اگلے زمانے میں ایک دیہاتی کی کسی شہری سے شناسائی ہوگئی۔ جب دیہاتی شہر کو آتا تو ڈیرے خیمے اس شہری کے مکان کے پاس نصب کرتا۔ دو دو تین تین مہینے اس کا مہمان رہتا اور ہمیشہ اسی کی دوکان اور اسی کے دسترخوان پر ڈٹا رہتا۔ زمانۂ مہمانی میں جو ضرورتیں اسے پیش آتیں شہری دوست اُن کو بھی پورا کرتا۔ ایک دن دیہاتی نے شہری سے کہا کہ کیوں صاحب، آپ ہمارے گانو کی طرف تفریح کے لیے بھی کبھی نہیں آتے آپ کو قسم ہی، سب بال بچوں کو لے کر آئیے کہ یہ زمانہ گل بوٹوں کے کھلنے اور بہار کا ہی۔ یا اگر اب ممکن نہیں تو گرمیوں میں آئیے کہ وہ زمانہ درختوں میں ثمر آنے کا ہی تاکہ آپ کی خدمت گزاری بجا لاؤں۔ اپنے ملازموں، بال بچوں اور بھائی بندوں کو بھی ساتھ لائیے اور تین چار مہینے ہمارے گانو میں آرام کیجیے۔ موسمِ بہار میں جنگل بہت پر فضا ہوتا ہی، کھیتیاں لہلہاتی اور لالہ و گُل سے رنگین ہوتی ہیں۔

وہ شریف شہری مروّت سے ہوں ہوں کر دیتا اور کچھ نہ کچھ بہانے سے بات ٹال دیتا کبھی کہتا کہ اس سال فلاں علاقے سے میرے ہاں مہمان آئے ہیں۔ کبھی کہتا کہ اگر سالِ آیندہ ضروری کاموں سے فرصت ملی تو تمھاری طرف آؤں گا مگر دیہاتی

ہر سال کلنگ کی طرح آتا اور شہری کے گھر میں آن دھمکتا تھا۔ آخری مہمان داری میں شہری نے پورے تین مہینے صبح و شام کھانا کھلایا۔ دیہاتی نے اس مہمان نوازسے ذرا شرما کر کہا کہ اجی حضرت! آخر کب تک آنے کے دھوکے میں رکھوگے۔ خواجہ نے کہا کہ میں تو تمھارے ہاں آنا چاہتا ہوں مگر یہاں سے سرکنا خدا کے اختیار میں ہے۔ آدمی بادبانی کشتی ہے جب چاہے وہ ہوا چلانے والا کنارے کی طرف لائے۔ دیہاتی نے کئی کئی قسمیں دے کر کہا کہ اے مہربان! ذرا اپنے بال بچّوں کو لے کر دہاں کی سیر بھی دیکھو۔ ہاتھ پکڑ لیا اور تین بار وعدہ لیا کہ ضرور ضرور آنا۔

ایک دن خواجہ کے بچّوں نے کہا کہ ابّا جان! چاند، بادل اور سایہ تک حرکت کرتا ہے۔ تم نے ان کی مہمان داری کا حق ادا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی بلکہ ان کی خدمت گزاری میں تکلیفیں اور پابندیاں برداشت کی ہیں اس لیے وہ چاہتا ہے کہ اگر کبھی تم اس کے مہمان ہو تو تمھارے احسانات کا بدل کرے۔ اس نے ہم سے بھی بڑی خاطر خوشامد سے کہا ہے کہ ہم ترغیب دے کر آپ کو دیہاتی کے گانْو کو لائیں۔ خواجہ نے کہا یہ سب سچ ہے مگر عقل مندوں نے کہا ہے کہ "اپنے احسان مند کے شر سے بچے رہو۔"

دیہاتی نے چاپلوسی کا وہ جال بچھایا تھا کہ خواجہ کی دور اندیشی متزلزل ہو گئی۔ خواجہ کے بچّے خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے کہ گانْو میں پہنچ کر خوب خوب سیریں گے اور جنگل میں کھیل کود کے دل بہلائیں گے۔

القصّہ خواجہ نے سفر کی تیاری کی اور گانْو کو روانہ ہوا۔ اس کے بال بچّے بھی اپنا اپنا سامانِ سفر مہیّا کر کے چل نکلے۔ خوشی کے مارے اُچھلتے کودتے راستہ طے کر رہے تھے کہ وہاں سبزہ زار بھی ہیں اور میزبان بڑا فیاض ہے جس نے بڑی بڑی آرزوؤں سے بلوایا ہے اور ہمارے لیے یہاں سے وہاں تک بخشش کے بیج بو دیے ہیں۔ اب جاڑے کے موسم تک وہاں رہ کر شہر کو واپس آئیں گے۔

یہ قافلہ دن بھر دھوپ میں جلتا اور رات بھر ستاروں کو دیکھ کر راستہ نکالتا چلا جا رہا تھا لیکن راستے کی دشواریاں گانو کو پہنچنے کی خوشی نے ہیچ کر دی تھیں سب ہنستے کھیلتے جا رہے تھے اور گانوں کی خیالی آسایشوں اور آراموں پر اس قدر دموں دیوانے تھے کہ اگر پرندے کو ادھر اُڑتا ہوا دیکھتے تھے تو بے اختیار ہو کر پھولے نہ سماتے اور جو کوئی مسافر اس گانو کے ادھر آتا مل جاتا اس سے لپٹ لپٹ کر گلے ملتے اور پوچھتے کہ بھائی! ہمارے عزیز دوست کو بھی جانتے پہچانتے ہو۔ اس طرح یہ تھکا ماندہ قافلہ مہینہ بھر کی منزلیں مار کر جب اس گانو میں پہنچے تو دیکھنا! وہ دیہاتی بالکل انجان ہو گیا اور دن دہاڑے کہیں باہر چل دیا کہ شہری قافلے کی مہمان داری سے بچے۔ یہ لوگ پوچھتے پھجتے اس کے گھر پر پہنچے اور عزیزوں کی طرح دروازے پر آئے مگر دیہاتی کے آدمیوں نے گھر کا دروازہ بند کر لیا اور خواجہ یہ حال دیکھ کر مارے غصّے کے دیوانہ ہو گیا۔ لیکن غصّہ بے موقع تھا کیوں کہ گڑھے میں گر جانے کے بعد ڈانٹ ڈپٹ سے کیا حاصل۔ الغرض یہ قافلہ پانچ دن تک اس دیہاتی کے دروازے پر ٹھیرا رہا، رات بھر سردی میں ٹھٹرتا اور دن بھر دھوپ کھاتا تھا۔ ان بے چاروں کا قیام نہ تھکے ماندے پن کی وجہ سے تھا نہ بے وقوفی کے سبب سے بلکہ ہاتھ میں پائی نہ رہی تھی اس لیے حیران تھے کہ کیا کریں۔

اکثر ہوتا ہی کہ شریف لوگ بے بسی کی حالت میں کمینے بخیلوں کے دست نگر ہو جاتے ہیں بلکہ جب بھوک حد سے بڑھ جاتی ہی تو شیر مردار تک کھانے لگتا ہی۔ خواجہ دور سے دیہاتی کو دیکھ کر سلام کرتا اور پکار کر کہتا تھا کہ میں تمھارا دوست فلاں خواجہ ہوں۔ دیہاتی دور سے جواب دیتا تھا کہ میں نے آپ کو نہیں پہچانا میں تو اپنی عبادات اور ادائے فرض میں ایسا محو ہوں کہ اپنی بھی سُدھ بدھ نہیں بلکہ مجھے یہ بھی خبر نہیں کہ زندہ ہوں یا مردہ۔ خواجہ نے کہا کہ میرے لیے یہ وقت قیامت سے کم نہیں

جس میں بھائی بھائی سے دور بھاگے گا۔ اس نے اپنی گزری ہوئی خدمتیں جتائیں اور کہا کہ میں وہی تو ہوں جس کے دسترخوان پر تم نے دونوں وقت کیا کیا نعمتیں کھائی ہیں ہماری مہمان نوازی سے ایک جہان آگاہ ہے اور کھائے پیے کی لاج ہر ایک کو ہوتی ہے۔ لیکن وہ یہی کہتا تھا کہ یہ کیا بک رہا ہے۔ نہ میں تجھے جانوں نہ تیرا نام جانوں نہ تیری مہمانی کی خبر۔

خدا کی کرنی یہ کہ پانچویں رات کو بادل گھر آیا اور اس قدر بارش ہوئی کہ آسمان سے ٹلیاں بہنے لگیں۔ جب خواجہ کی ہڈی پر چھری آن لگی تو کنڈی کھٹکھٹائی اور نوکروں سے کہا کہ اپنے سرکار کو بلاؤ۔ جب خواجہ بہت رویا دھویا تو وہ ظالم دروازے پر آیا اور کہا کہ آخر تو کیا کہنا چاہتا ہے۔ خواجہ نے کہا کہ میں نے مہمانی کے سب حقوق چھوڑے اور جو کچھ میں سمجھا تھا اُس سے بھی باز آیا۔ دھوپ اور سردی کی مصیبت میں یہ پانچ دن پانچ برس کی برابر ہم پر بھاری کٹے لیکن اب بارش کی تکلیف اٹھانی دوبھر ہوگئی ہے بہتر ہے کہ مجھے قتل کر دیجیے میں اپنا خون بخشتا ہوں ورنہ رات کی رات مینہ سے بچنے کے لیے مکان کا ایک گوشہ ہمیں دے دیجیے خداوند تعالیٰ روزِ قیامت آپ کو اس کا اجر دے گا۔ دیہاتی نے کہا صرف وہ جگہ جہاں ہمارا باغبان رہتا ہے اور بھیڑیے کی نگرانی کرتا ہے وہ مل سکتی ہے۔ ہم اس کو تیر کماں دے دیتے ہیں تاکہ اگر بھیڑیا آئے تو اس کو مارے۔ اگر تو یہ خدمت بجالائے تو جگہ حاضر ہے ورنہ کوئی دوسرا گھر ڈھونڈ لے۔ خواجہ نے ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ ایسی ایسی سو خدمتیں بھی انجام دینے کو میں حاضر ہوں، لائیے وہ تیر کمان مجھے دے دیجیے۔ آپ کے مویشی اور انگوروں کی پاسبانی ساری رات میں کروں گا اور اگر بھیڑیے کی بھنک بھی پڑ جائے تو اسی نشان پر تیر ماروں گا۔ غرض اس قرارداد پر باغ کا ایک کونہ خالی تھا اس میں وہ بال بچوں سمیت جا گھسا۔ دیکھا کہ جگہ اس قدر تنگ ہے کہ اِدھر سے اُدھر کھسکنے کی گنجائش نہیں اور برساتی پانی اس میں بھی گھُس رہا تھا، وہ سب ٹڈیوں کی طرح ایک پر ایک وہیں سما گئے۔ رات بھر یہی کہتے رہے کہ اے خدا! جو ذلیلوں سے دوستی کرے اور نالائقوں سے شرافت کے ساتھ

پیش آئے اُس کی یہی سزا ہی۔ بہرحال وہ شہری تیر کمان ہاتھ میں لیے رات بھر پاسبانی کرتا رہا۔ ادھر اس کال کوٹھری میں ہر مچھر اور پسّو بھیڑیا بنا ہُوا تھا اور زخم پر زخم لگا رہا تھا بھیڑیے کے آجانے کے خوف سے اس بے چارے کو مچھر اُڑانے کی بھی مہلت نہ تھی کہ کہیں بھیڑیا آکر کوئی نقصان پہنچا دے اور وہ دیہاتی آکر ڈاڑھی نوچ ڈالے۔ آدھی رات تک دانتوں میں اُنگلی پکڑے باغ کا چپہ چپہ دیکھتا رہا، مارے تھکن کے سانس ناف سے ہونٹوں پر آتا تھا۔ اتفاقاً بھیڑیے کی شکل کے ایک جانور نے درختوں کی باڑ میں سر نکالا خواجہ نے فوراً تیر کو چلّے پر چڑھا کر ایسا نشانہ لگایا کہ وہ جانور وہیں اُلٹ کر گرا۔ وہ جانور جو گرا تو اس کا گوز نکل گیا اور اس کی آواز دیہاتی نے سنی۔ وہیں ہائے کا نعرہ مارا اور سر پیٹنے لگا۔ اور کہا کہ ارے نامعقول یہ تو میرا بچھیرا تھا۔ خواجہ نے کہا نہیں وہ بھیڑیا شیطان کی طرح چھپا ہوا آیا تھا۔ دیہاتی نے کہا کہ ہرگز نہیں۔ میں اس کے گوز کی آواز کو خوب پہچانتا ہوں۔ تو نے یقیناً میرے بچھیرے کو عین سبزہ زار میں مار ڈالا۔ خواجہ نے کہا کہ آپ اچھی طرح تحقیق کرلیں کیوں کہ رات کی اندھیری میں کوئی چیز سوجھا نہیں کرتی اور یہ رات تو گھٹا اور مینہ کی وجہ سے اور بھی تاریک ہی ممکن ہی کہ مجھے غلط نظر آیا ہو۔ دیہاتی نے کہا کہ تجھ پر رات تاریک سہی مگر چونکہ اپنی گدھی کے بچھیرے کی ہر آواز پہچانتا ہوں اس لیے یہ رات مجھ پر روزِ روشن کی مانند ہی۔ یہ سنتے ہی خواجہ بلبلا اُٹھا اور دیہاتی کے گریبان میں ہاتھ ڈالا اور کہا اے بناوٹی بھولے تو نے بڑی چال کھیلی جیسے کسی نے بھنگ اور افیون ملا کر استعمال کی ہو، جبکہ تو اس اندھیرے میں بچھیرے کے گوز کی آواز کو پہچانتا ہی تو مجھے کیسے نہیں پہچانتا جو شخص آدھی رات کی اندھیری میں اپنے بچھیرے کو پہچان لے وہ دس برس کے قدیم دوست کو شناخت نہ کرے۔ تو دعوےٰ کرتا ہی کہ مجھے اپنی بھی خبر نہیں اور میرے دل میں سوائے خدا کے کچھ نہیں اور تو کہتا ہی کہ جو کچھ کل میں نے کھایا تھا وہ تک یاد نہیں۔ ایسی بے خودی کے عالم میں مجھے جان پہچان سے معاف کرو۔ تو فقیری اور بے خودی کی بڑیں ہانکتا تھا اور عاشقانِ خدا

کی سی باتیں بناتا تھا کہ مجھے زمین و آسمان میں تمیز نہیں کہ غیرتِ خدا نے تیری آزمائش کرادی کہ تیرے بھیڑیے کے گوز نے تجھے رسوا کردیا اور بے خودی کا راز افشا کردیا۔ خداوند تعالےٰ دھوکے اور فریب کو اسی طرح رسوا کیا کرتا ہے اور بھاگے ہوئے شکار کو یوں ہی گرفتار کراتا ہے۔ ارے بے وقوف ایسی مستی مت کر کہ جب تو ہوش میں آئے تو پشیمان ہو بلکہ ان مستوں میں شریک ہو کہ جب وہ مے پیتے ہیں تو بڑے بڑے عقلمندان کی باتوں اور حرکتوں پر عش عش کرتے ہیں +



مجنونؒ اور لیلیٰ کی گلی کا کتّا

مجنونؒ ایک کتّے کی بلائیں لیتا تھا، اس کو پیار کرتا تھا اور اس کے آگے بچھا جاتا تھا۔ جس طرح حاجی کعبے کے گرد سچّی نیّت سے طواف کرتا ہے اسی طرح مجنونؒ اس کتّے کے گرد پھر کر صدقے قربان ہو رہا تھا۔ کسی بازاری نے دیکھ کر آواز دی کہ ای دیوانے یہ کیا پاکھنڈ تو نے بنا کر رکھا ہے۔ کتّے کا بچّہ ہمیشہ غلاظت کھاتا ہے اور اپنے چوتڑوں کو اپنی ہی زبان سے چاٹا کرتا ہے۔ اسی طرح کتّے کے بہت سے عیب اس نے گنائے کیوں کہ عیب دیکھنے والا غیب کی بھنک بھی نہیں پاتا۔ مجنوں نے کہا کہ تو ظاہری صورت کا دیکھنے والا ہے ذرا گہرائی میں اُتر اور میری آنکھوں سے اسے دیکھ کہ یہ میرے مالک کی محبت میں گرفتار ہے یعنی کوچہ لیلےٰ کا نگہبان ہے۔ ذرا اس کی ہمّت اور اس کے انتخاب پر تو غور کر کہ اس نے کس مقام کو پسند کیا ہے۔ وہ جگہ جو میرے دل کا چین ہے یہ اس جگہ کا مبارک کتّا ہے۔ وہ میرا ہمدرد او ہمجنس ہے۔ جو کتّا لیلیٰ کے کوچے میں رہ گیا اس کے پاؤں کی خاک بڑے بڑے شیروں سے بھی افضل ہے۔ میں شیر کو اس کے ایک بال برابر بھی نہیں سمجھتا۔

اسی لیے دوستو! اگر صورت سے نظر اُٹھالو اور معنیٰ میں پہنچ جاؤ تو وہاں جنّت

ہی جنت ہی +

ایک گیدڑ کی شیخی جو رنگ کے نندولے میں گر پڑا تھا

وہم کی لذّت سے تو اپنا دل اس طرح خوش کر لیتا ہی جیسے کوئی شخص پھونک کر ا پنی مشک کو پُھلالے حالانکہ وہ پھولی ہوئی مشک سوئی کے ایک چھید میں ہوا سے خالی ہوگئی ہی۔

یہ حکایت سُنو کہ ایک گیدڑ رنگ کے نندولے میں گر پڑا اور ایک گھنٹے تک اسی میں پڑا رہا۔ جب نکلا تو دیکھا کہ اس کی کھال رنگین ہوگئی ہی یہ دیکھ کر کہنے لگا کہ او ہو' میں تو مور ہو گیا۔ اس کے رنگین بال بہت خوب صورت ہوگئے اور دھوپ میں بالوں کا رنگ اور بھی چمکنے لگا۔ اس نے جو دیکھا کہ سرخ، سبز، عنابی اور زرد سب قسم کے رنگوں سے رنگین ہی تو دوسرے گیدڑوں کے سامنے پہنچا اور اترانے لگا۔ سب نے کہا اے گیدڑے یہ تیرے کیا سر میں سمائی ہی کہ اپنے کو اونچا کھینچ کر ہم سے الگ ہو گیا۔ یہ غرور تو نے کہاں سے پیدا کیا ؟ تو جوش میں تو آ گیا مگر گرمی کا نام نہیں۔ تو نے تو مکر سے بے شرمی کا جال پھیلایا ہی۔ اس رنگے ہوئے گیدڑ نے ملامت کرنے والے کے کان میں کہا مجھے اور میرے رنگوں کو دیکھو تو سہی کہ بت خانوں میں ایک صنم بھی اتنا خوب صورت نہیں۔ ای گیدڑو! اب تم مجھ کو گیدڑ نہ پکارو بھلا گیدڑ کو یہ حسن و جمال کہاں نصیب ؟ سارے گیدڑ اس کے اطراف جمع ہوگئے اور پوچھنے لگے کہ ای صاحبِ کمال! ہم تجھے کیا پکاریں۔ اس نے کہا کہ میرا نام مور ہی۔ انھوں نے جواب دیا کہ مور تو باغوں میں بہار دکھاتے ہیں تو کیا تو بھی باغوں کا رہنے والا ہی؟ اس نے کہا کہ نہیں میں جنگل ہی میں نہیں ناچتا تو باغ کا کیوں کر اقرار کروں۔ پھر انھوں نے پوچھا کہ آیا تو مور کی سی آواز نکال سکتا ہی ؟ جواب دیا کہ نہیں۔ گیدڑوں نے کہا کہ اے احمق پھر تو کیوں کر مور ہو گیا ؟

مورکا رنگ برنگی خلعت قدرت سے اسے ملتا ہے نقط کھال رنگ لینے سے تجھ میں مور کے اوصاف کہاں سے آجائیں گے؟ +



ایک شیخی خورے کا ہونٹ اور موچھوں کو چربی چکنا نا

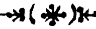
سچائی اور جوش اولیاء کا شعار ہے اس کے مقابل دغا بازوں کی ڈھال بے شرمی ہے۔ مخلوقِ خدا کو اپنے دام میں گرفتار کرنے کے لیے ظاہر کرتے ہیں کہ ہم بالکل خوش اور بے فکر ہیں دراں حالیکہ ان کا باطن سراسر پریشان ہوتا ہے۔

ایک سفلے شخص کو دُنبے کی چکتی کا تکا مل گیا۔ روزانہ صبح کو اس سے اپنی موچھیں چکنی کر کے تاؤ دینے لگا۔ وہ امیروں میں جا بیٹھتا اور کہتا کہ آج خوب مرغن چیزیں کھانے میں آئیں اور ثبوت میں موچھوں پر تاؤ دیتا تھا۔ مطلب یہ کہ دیکھو موچھیں تک چکنی ہو رہی ہیں۔

وہ تو اپنی دولت مندی کا دعویٰ کرتا اور اس کا معدہ موچھوں پر لعنت ملامت بھیجتا تھا کہ ای خدا ان کمینے شیخی جتانے والوں کی قلعی کھول دے کہ شاید کوئی خدا کا سخی میری بھوک دُور کرے۔ آخر خدا نے پیٹ کی فریاد سُن لی اور ایک روز ایک بلی چربی کا وہ تکا لے اُڑی۔ گھر کے لوگ بلی کے پیچھے دوڑے مگر وہ ہاتھ نہ آئی۔

باپ کی خفگی کے ڈر سے بچے کا چہرہ فق ہو گیا۔ اس نے بھری محفل میں آکر شیخی خور باپ کی عزت خاک میں ملادی۔ یعنی اس نے کہا کہ وہ چربی کا تکا جس سے آپ ہر صبح کو ہونٹ اور موچھیں چکنا یا کرتے تھے اس کو بلی لے گئی۔ ہم نے بہتیرا اس کا پیچھا کیا مگر ناکام رہے۔ وہ شیخی باز اُس وقت بھی بیٹھا ڈینگیں ہانک رہا تھا۔ یہ جو سُنا تو رنج کے مارے دم بخود ہو گیا۔ وہ بھری محفل میں اس قدر شرمندہ ہوا کہ سر جھکا کر

خاموش ہو رہا اور پھر زبان نہ ہلائی۔ اہلِ محفل کو بڑی حیرت ہوئی۔ کچھ ہنسی بھی آئی ۔ مگر دولت مندوں نے اس کے حال پر رحم کھایا اور پھر وہ اس کی دعوتیں کرکے اس کا پیٹ بھرنے لگے ۔ جب اس نے اہلِ کرم کے برتاؤ سے سچائی کی لذت پائی تو تکبر کو ترک کرکے سچائی کا غلام ہوگیا۔ پس تو بھی سچائی اختیار کر تاکہ دونوں عالم میں نیک نام رہے ❖



ایک سپیرے کا ٹھٹھرے ہوئے اژدہے کو بغداد میں لانا

جو غرور فرعون میں تھا وہ تجھ میں بھی موجود ہے لیکن تیرے اژدہے کنویں میں بند ہیں ۔

کہتے ہیں ایک سپیرا پہاڑ پر سانپ پکڑنے گیا وہ برف باری کے زمانے میں ڈھونڈتا پھر رہا تھا کہ اس نے ایک بہت بڑا مردہ اژدہا دیکھا جس کے دیکھنے سے اس کا دل خوف زدہ ہوگیا ۔ سپیرا تو نادان عوام کو حیران کرنے کے واسطے سانپ پکڑا کرتا ہے۔ اس نے مردہ اژدہا اُٹھایا اور شہر بغداد میں اس کا تماشا دکھانے لایا ۔ اژدہا کیا تھا، پورا ستون کا ستون تھا ۔ اُسے باندھ کر کھینچتا ہوا لایا اور پکارا کہ میں ایک مردہ اژدہا لایا ہوں ۔ اس کے شکار میں میں نے اپنی جان جوکھوں میں ڈال دی تھی ۔ وہ تو اس کو مردہ گمان کرتا تھا لیکن در اصل اژدہا زندہ تھا۔ وہ سردی اور برف باری سے ٹھٹھر گیا تھا اور مردہ دکھائی دیتا تھا۔ القصہ ایک تالاب کے کنارے اس نے پکارنا شروع کیا جس سے شہر بغداد میں یہ خبر پھیل گئی کہ سپیرا ایک اژدہا لایا ہے اور بہت نادر قسم کا ہے جو آج تک نہ دیکھا گیا اور نہ سُنا گیا ۔ ہزاروں بے وقوف جمع ہوئے ۔ سپیرا انتظار میں تھا کہ اور زیادہ خلقت جمع ہو جائے تو دکھائے کیوں کہ جس قدر لوگ زیادہ ہوں پیسے بھی زیادہ ملتے ہیں ۔ غرض خلقت

کا اژدہام اس قدر ہوا کہ تل دھرنے کو جگہ نہ رہی۔ یکا یک اژدہے نے اپنا منہ کھولا پھر تو دیکھنے والوں کا مارے دہشت کے مُنہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ اژدہا برف سے ٹھٹھرا ہوا تھا اور بہت سے ٹاٹ کے ٹکڑوں اور پردوں میں چھپا ہوا تھا اور رسیوں میں بندھا ہوا تھا۔ ایک طرف تو لوگوں کے جمع ہونے میں دیر ہوئی اور لوگوں نے غل غپاڑا مچایا۔ دوسری طرف ملکِ عراق کا گرم آفتاب چمکا۔ اس گرمی سے وہ اژدہا جو سنکا اور اُس کے جوڑ بند کھلے تو وہی مردہ اژدہا زندہ ہو کر رینگنے لگا۔ یہ دیکھ کر خلقت میں چیخم دھاڑ اور ایک دم بھاگڑ پڑ گئی۔ اس نے ساری رسیاں توڑ ڈالیں اور بڑی زبردست سرسراہٹ کی آواز کے ساتھ ہر طرف پھرنے لگا۔ وہ بالکل قبضے سے باہر ہو گیا اور شیر کی طرح غرّایا۔ اس بھاگڑ میں اس قدر مخلوق کچلی گئی کہ بہت سے لوگ مر گئے۔ ادھر سپیرے کے مارے خوف کے ہاتھ پیر پھول گئے اس نے اپنے جی میں کہا کہ ہائیں! میں پہاڑیوں میں سے یہ کیا اُٹھا لایا اس اندھے بھیڑیے کو میں نے ہشیار کر دیا اور اپنے ہاتھوں اپنی موت بلائی۔ اتنے میں اژدہے نے اس کا لقمہ کیا اور نہتّے کا کھا جانا کیا بڑی بات ہے۔ اس کے بعد اژدہے نے ایک ستون سے اپنے کو لپیٹا اور ایسا ایک بل کھایا کہ اس سپیرے کی ہڈیاں تک چُورا چُورا ہو گئیں۔

تیرا نفس بھی اژدہا ہے یہ ہرگز مردہ نہیں بلکہ بے سروسامانی کی وجہ سے ٹھٹھرا ہوا ہے۔ فرعون جس کے حکم سے دریا کا پانی رواں ہوتا تھا، اگر ویسی قدرت و حکومت تجھ کو مل جائے تو تو بھی ایسی فرعونی کرے گا کہ سو موسیٰ اور سو ہارونؑ پچھاڑ مارے گا۔

لوگوں کا اندھیری رات میں ہاتھی کی شناخت پر اختلاف کرنا

اے تہ دیکھنے والے، کافر و مومن و بت پرست کا فرق الگ الگ پہلو سے نظر ڈالنے کے باعث ہی تو ہے۔

کسی غیر ملک میں اہلِ ہند ایک ہاتھی دکھانے لائے اور اسے بالکل تاریک مکان میں باندھ دیا۔ لوگ باری باری سے آتے اور اس اندھیرے گھر میں داخل ہوتے وہاں صاف کچھ نظر نہ آتا تھا اس لیے ہر شخص اس کو ہاتھ سے ٹٹولتا تھا۔ جس کا ہاتھ سونڈ پر پڑا اُس نے کہا کہ ہاتھی نلوے جیسا ہے اور جس کا ہاتھ کان پر پڑا اس نے جانا کہ وہ پنکھے جیسا ہے اور جس کا ہاتھ پیر پر پڑا اُس نے کہا کہ وہ ستون جیسا ہے اور جس کا ہاتھ اس کی پیٹھ پر پڑا اُس نے کہا کہ ہاتھی تو تخت کی مانند ہے۔ اسی طرح ہر شخص جانتا تھا کہ بس ہاتھی ویسا ہی ہے جیسا کہ اس نے ٹٹول کر جانا ہے۔ ہر ایک کی ٹٹول جُدا تھی۔ اس لیے کسی نے دال کہا اور کسی نے الف۔ اگر ہر شخص کے ہاتھ میں شمع ہوتی تو سب کا اختلاف مٹ جاتا۔ آنکھوں کی بینائی بھی ہاتھ کی مانند ہے کہ ہاتھ پورا ہاتھی معلوم کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ دریا کا پاٹ اور ہے اور دریا کے جھاگ دوسری چیز ہیں۔ تجھے چاہیے کہ جھاگ سے نظر ہٹائے اور آنکھوں سے دریا کو دیکھے۔ رات دن دریا سے جھاگ اُٹھتے ہیں تو انھیں دیکھتا ہے مگر تعجب ہے کہ دریا کو نہیں دیکھتا۔



کنعان کا نوحؑ کے بلانے کو نہ ماننا

جب تک کہ روح تیرے لیے خود نہ بول اُٹھے تو زبان نہ ہلا، نوحؑ کی کشتی میں بیٹھ اور اپنا تیرنا چھوڑ جیسے کہاوت ہے کہ کنعان جو بڑا تیراک تھا کہنے لگا کہ نوح ہمارا دشمن

ہے، ہمیں اس کی کشتی نہیں چاہیے ۔ بہتیرا نوحؑ نے کہا کہ آ ہمارے ساتھ کشتی میں بیٹھ تاکہ طوفان میں غرق ہونے سے بچ سکے ۔ مگر کنعان نے جواب دیا کہ میں تیرنا جانتا ہوں ، میری شمع میرے ساتھ ہے تیری شمع کی کیا پروا ۔ نوحؑ نے کہا ہائیں ایسا نہ کر، یہ طوفان ایک بلا ہے ۔ ساری تیراکی رہ جائے گی ۔ ہاتھ پیر شل ہو جائیں گے ۔ ہوا کے جھکڑ سب شمعوں کو بجھا دیں گے ۔ اس میں سوائے حق کی شمع کے اور کوئی روشن نہ رہ سکے گی ۔ کنعان نے کہا کہ میں اونچے پہاڑ پر چڑھ جاؤں گا اور پہاڑ ہر طغیانی سے محفوظ ہے ۔ نوحؑ نے کہا خبردار ایسا نہ کرنا ۔ وہ پہاڑ بھی اس موقع پر گھانس کی ایک پتی کے برابر ہے اور خدا سوائے اپنے دوستوں کے اور کسی کو نجات نہ دے گا ۔ کنعان نے کہا کہ میں نے آج تک تیری نصیحت کب سُنی تھی کہ تو اب میرے نصیحت ماننے کی امید کرتا ہے ۔ مجھے ہرگز تیری بات پسند نہیں آئی ، میں دونوں جہان میں تجھ سے الگ ہوں ۔ نوحؑ نے کہا کہ اے فرزند اس وقت ضدی مت بن یہ موقع اَڑ کرنے کا نہیں ہے کیوں کہ خدا کا نہ کوئی رشتے دار ہے نہ کوئی برابری والا ۔ تو نے جو کچھ کیا سو کیا مگر یہ وقت نازک ہے، اس بارگاہ میں کس پر کون ناز کر سکتا ہے ۔

الغرض وہ اس طرح نصیحتیں کرتا اور اسے بلاتا رہا اور سخت جواب سُنتا رہا نہ باپ نصیحت سے باز آیا نہ اس بدبخت نے کوئی بات مانی ۔ یہ دونوں ان ہی باتوں میں تھے کہ ایک تیز موج آئی اور سوکھے پتّے کی طرح کنعان کو بہا کر ریزہ ریزہ کر دیا ۔ نوحؑ نے بارگاہِ ایزدی میں عرض کی اے رحیم و کریم بادشاہ میرا گدھا مر گیا اور تیری موج میری کملی کو بہا لے گئی ۔ تو نے تو مجھ سے بارہا وعدہ کیا کہ میرے لوگ طوفان سے بچے رہیں گے ۔

ارشادِ خداوندی ہوا کہ وہ تیرے لوگوں میں سے نہ تھا ۔ تجھے خود سفید اور نیلے میں تمیز نہیں رہی ۔ جب تیرے دانت میں کیڑا لگ جائے تو اُس دانت سے ہاتھ دھو اور اس کو اُکھڑوا دے ۔ اگرچہ وہ دانت تیرا ہی تھا مگر تو اس سے بیزار ہو جا تاکہ تیرا باقی

جسم اس دانت سے دردمند نہ ہو جائے۔ نوحؑ نے عرض کی کہ میں تیری ذات کے سوا غیر سے بیزار ہوں اور وہ کون غیر ہے جو تجھ سے نہ ہارا ہو۔ تو خود جانتا ہے کہ تیرے ساتھ میرا کیا حال ہے۔

پھر ارشاد ہوا کہ اے نوحؑ اگر تو سب کو دوبارہ پیدا کرانا چاہے تو ابھی زمین سے اُٹھا دوں گا۔ ایک کنعان کے لیے میں تیرا دل نہیں توڑوں گا۔ لیکن اس کے احوال سے تجھے آگاہ کرتا ہوں۔ حضرت نوحؑ نے عرض کی کہ نہیں نہیں اگر تجھے منظور ہو تو مجھے بھی غرق کردے میں راضی ہوں۔ اگر تو مجھے مارے گا تو وہ موت ہی میری جان ہو جائے گی۔ میں تیرے سوا کسی کو نہیں دیکھوں گا۔

خدا کی صنعت کا دل دادہ صاحبِ عزّت ہوتا ہے مگر جو بنی ہوئی چیز پر فریفتہ ہو وہ کفر کی ذلت میں مبتلا ہو جاتا ہے +



حیرت کا غلبہ بحث و فکر کو روک دیتا ہے

ایک کھچڑی ڈاڑھی کا ادھیڑ آدمی حجّام کے ہاں آیا اور کہا کہ میری ڈاڑھی سے سفید بال چُن دے کہ میں نے نئی شادی کی ہے۔ خاص تراش نے پوری ڈاڑھی مونڈھ کر سامنے رکھ دی اور کہا کہ میاں! آپ ہی اپنی مرضی کے مطابق چُن لو مجھے فرصت نہیں۔

اس سوال و جواب کا مطلب یہ ہے کہ دین دار آدمیوں کو باریکیاں تراشنے کی فرصت نہیں ہوتی۔

ایک شخص نے زید کے چانٹا رسید کیا، زید نے بدلہ لینے کو حملہ کیا۔ چانٹا مارنے والے نے کہا کہ میں تجھ سے ایک سوال کرتا ہوں اس کا جواب دے پھر جتنا چاہے مار لے میں نے جو تیری گُدی پر چانٹا مارا تو طراق سے آواز آئی، تو یہ بتا کہ یہ آواز میرے ہاتھ

کی تھی یا تیری گُدّی کی۔ اس نے جواب دیا کہ درد اور تکلیف سے اتنی فرصت کسے ہے کہ آواز پر غور کرے۔ تجھے کوئی تکلیف نہیں ہے تو سوچتا رہ۔ جو درد میں مبتلا ہوتا ہے اُس کو ایسی فکریں نہیں ہوتیں۔ چاہے مسجد میں جا کر دیکھ اور چاہے بُت خانے میں۔ جو دردمند ہے اُس کو دوسری فکر نہیں ہوتی۔ تیری بے دردی اور غفلت ہی فکر پیدا کرتی ہے +



کسی چاہنے والے کا اپنے مطلوب کے سامنے خط پڑھنا

ایک شخص کو معشوق نے اپنے سامنے بلا کر بٹھایا، اس نے جیب سے خط نکال کر معشوق کے سامنے پڑھنا شروع کیا۔ اس خط میں بہت سے اشعار، معشوق کی مدح و ثنا، اپنی بے تابی و بے قراری، سب عزیزوں دوستوں سے بیزاری، معشوق سے دوری اور ہجر کی تکلیف، اپنے پیغام اور پیغامبر کا ذکر پوری تفصیل سے تھا۔ یہ عشقیہ مضمون دیر تک پڑھتا رہا۔ معشوق نے کہا کہ اگر یہ خط تو مجھے سُنا رہا ہے تو وصل کے موقع پر اپنی عمر ضائع کر رہا ہے۔ میں تیرے سامنے موجود ہوں اور تو خط پڑھنے میں مصروف ہے یہ چال ڈھال عاشقوں کی نہیں۔ اس نے کہا کہ اگرچہ تو موجود ہے لیکن میں نے اگلے سال جو توجہ تیری دیکھی تھی وہ اس وقت نہیں ہے۔ اب میں چشمہ تو دیکھ رہا ہوں مگر اس میں پانی نہیں ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چشمے تک پہنچنے کا راستہ ڈاکوؤں نے روک لیا ہے۔ معشوق نے کہا کہ بس تو میں تیرا معشوق نہیں۔ میں بلغار میں ہوں اور تیری مراد خراسان میں ہے۔ تو مجھ پر عاشق ہے اور میرے حال پر بھی عاشق ہے درآں حالیکہ حال تیرے اختیار میں نہیں۔ پس فقط میں تیرا مقصود نہیں ہوں لہٰذا میں تیرا معشوق نہیں بلکہ معشوق کا گھر ہوں۔ حالانکہ عشق اصل چیز سے ہوتا ہے اس کے صندوق سے نہیں ہوتا +



ایک شخص کا بے محنت روزی حلال طلب کرنا

ایک شخص حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں روزانہ یہ دعا کرتا تھا کہ ای خدا مجھے بے محنت روزی عطا کر۔ جب تو نے مجھے کاہل، بیمار اور ناکارہ پیدا کیا ہے تو زخمی پیٹھ کے گدھوں پر گھوڑوں اور اونٹوں کا بوجھ نہیں لادا جا سکتا۔ مجھے بے محنت و مشقت غیب سے ایسی روزی دے کہ میں سوائے تجھ سے مانگنے کے اور کوئی کوشش نہ کرنے پاؤں۔

بہت دن تک برابر یہی دعا کرتا رہا مخلوق اس کی لاحاصل طمع اور خدا سے زور رادوری کرنے پر ہنستی تھی۔ کہ یہ لمبی ڈاڑھی والا کیا بیہودہ بکتا ہے، کسی نے اسے بھنگ تو نہیں پلادی۔ روزی حاصل کرنے کا طریقہ تو محنت و مشقت ہی ہے۔ اس کے خلاف کبھی نہیں ہوتا۔

اس زمانے کے بادشاہ اور پیغمبر حضرت داؤد علیہ السلام تھے جو بڑے صاحبِ کمال تھے لیکن ایسی شان و شوکت اور رسائی کے باوجود خدا نے ان کی روزی محنت و مشقت پر منحصر کی تھی۔ جب تک کہ آپ زرہ تیار کرنے کی تکلیف نہ اُٹھاتے آپ کو روزی میسر نہ آتی تھی۔ اس پر بھی ایک معمولی نکما آدمی حماقت سے یہ چاہے کہ بغیر محنت و تجارت روپے سے دامن بھر لے ایسا خزانہ تو دنیا میں کسی کو نہیں ملا، بھلا آسمان پر بے سیڑھی کے کون چڑھا۔ کوئی مذاق سے کہتا کہ ہمیں خوش خبری مل چکی جا اور اپنا خزانہ لے لے۔ کوئی کہتا کہ حضرت اگر خزانہ ہاتھ لگے کچھ ہمیں بھی دینا۔ لیکن وہ دُھن کا پکّا لوگوں کے طعن و مذاق اُڑانے سے اپنی دعا اور گڑگڑانا کم نہ کرتا تھا۔ جب اس نے دعاؤں کا تار باندھ دیا تو آخر اُس نے جو سب کی سُنتا اور مُرادیں بر لاتا ہے دعا سُنی۔ چاہے دعا ناگوار ہو اور چاہے جلد باز انہ ہو لیکن آخرکار مانگنے والا ضرور پاتا ہے۔

ایک دن صبح سویرے بہت ہی آہ وزاری سے وہ شخص اپنی وہی دعا رٹ رہا تھا کہ یکایک ایک گائے نے سینگ مار کر دروازہ توڑ ڈالا اور گھر میں گھس آئی۔ گائے تو بے جھجکے اس کے گھر میں آ پہنچی اور اس نے اُٹھ کر اس کے ہاتھ پیر باندھ دیئے اور اس کے بعد بلا تامل اسے ذبح کر کے فوراً قصاب کے پاس لے گیا تاکہ اس کی کھال چھیل کر صاف کر دے۔ گائے کے مالک نے بھی دیکھ لیا اور چلایا کہ ہائیں میری گائے تو بدک کر نکل گئی تھی، بتا تو نے اسے کس طرح مار ڈالا۔ ارے بھولے بدمعاش چل عدالت میں فیصلہ ہوگا۔ اس نے کہا کہ میں خدا سے بے محنت روزی طلب کرتا تھا اور کس کس عاجزی منت سے دعا کرتا تھا۔ برسوں سے میرا کام دعا مانگنا تھا یہاں تک کہ خدا نے میرے پاس گائے بھیج دی۔ جب میں نے گائے دیکھی تو جھٹ کھڑا ہو گیا چونکہ وہ میرا رزق تھا، میری مدتوں کی دعا قبول ہوئی اور مجھے روزی بے محنت ملی اس لیے میں نے اس کو ذبح کر ڈالا۔ بس یہ جواب ہے۔ گائے کا مالک مارے غصے کے لال پیلا ہو گیا۔ اس کا گریبان پکڑا اور منہ پر چند گھونسے لگائے اور اس کو داؤد نبیؑ کے پاس پکڑ کر لے چلا کہ اے ظالم چل تجھے اپنے کیے کی سزا دلاؤں۔ ارے دغاباز یہ دعا دعا کیا بکتا ہے اس نے کہا کہ میں نے بہت دعائیں مانگی ہیں اور اس خوشامد میں مدتوں اپنا خون آپ پیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ میری دعا قبول ہوئی ہے۔

مالک نے چیخنا شروع کیا کہ اے مسلمانو! ذرا یہاں آؤ اور اس کی بکواس تو سنو۔ یہ دعا مانگ کر میرا مال ہڑپ کرنے کا حق جتاتا ہے۔ اگر عالم میں یہی قانون ہوتا تو خالی دعا کرنے والے دولتِ دنیا کے مالک ہو جاتے۔ اگر ایسا ہی ہوتا تو سارے اندھے فقیر دولت مند امیر بن جاتے۔ وہ تو رات دن یہی دعا کرتے رہتے ہیں کہ یاالٰہی تو ہم کو دے اندھوں کی محنت و مشقت سوائے گڑگڑا کر دعا مانگنے کے اور کیا ہے، لیکن بھیک میں سوائے پانی اور روٹی کے انھیں اور کیا ملتا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ یہ مسلمان ٹھیک بات کہتا ہے اور یہ

دعا فروش ظالم ہے۔ ایسی ایسی دعاؤں سے کوئی دولت مند کیسے ہوسکتا ہے اور ایسا فعل شریعت کی حدود میں کیوں کر آسکتا ہے۔ کوئی شخص کسی چیز کا مالک اُسی حالت میں ہوسکتا ہے کہ یا خریدے یا بھیک سے حاصل کرے یا وصیت میں پائے یا کوئی خوشی سے دے دے۔ پس یا تو گائے واپس دو یا قید خانے کی سیر کرو۔ وہ آسمان کی طرف دیکھ کر کہتا تھا کہ اے رحیم و کریم میں نے مدتوں اسی آرزو میں دعائیں کی ہیں اور سوائے تیرے ان سے کوئی واقف نہیں۔ تو ہی نے میرے دل میں دعا ڈالی، سینکڑوں امیدوں کے چراغ روشن کیے۔ میں نے وہ دعائیں خالی خولی نہیں کی تھیں بلکہ یوسف کی طرح کتنے ہی خواب دیکھے تھے۔ اس دغا باز نے مجھے اندھا کہا ہے۔ اے خدا یہ اس کا قیاس ابلیسانہ ہے۔ بھلا میں نے اندھے پن سے دعا کب کی ہے۔ میں نے تو سوائے خدا کے کسی سے بھیک نہیں مانگی۔ اندھا تو اپنی نادانی کی بنا پر مخلوق سے سوال کرتا ہے مگر میں نے تو تجھ سے سوال کیا کہ تجھ پر ہر دشوار آسان ہے۔ مخلوق میرے بھید کو نہیں پہچانتی اور میری بات کو بیہودہ جانتی ہے۔ وہ بھی سچ کہتی ہے کیوں کہ سوائے بھید کے جاننے والے اور عیبوں کو چھپانے والے کے اور دوسرا کون ہے کہ غیب داں ہو۔

مدعی نے کہا کہ اے میری طرف دیکھ اور سچ سچ کہہ یہ آسمان کی طرف کیا دیکھتا ہے۔ یہ کیا پاکھنڈ بنایا ہے۔ دھوکے سے اپنی خدا رسی جتا رہا ہے۔ جب تیرا دل ہی مردہ ہے تو کس منہ سے آسمان کی طرف دیکھتا ہے۔ الغرض سارے شہر میں ہلکم مچ گئی اور اس دعا کرنے والے نے زمین پر سجدے میں سر رکھ دیا۔ کہ اے خدا اس بندے کو بدنام نہ کر، اگر میں برا بھی ہوں تو میری برائی کو فاش نہ کر۔ تو جانتا ہے کہ طویل طویل راتوں میں کس کس عجز و زاری کے ساتھ تجھے پکارتا ہوں۔ اگر میری عبادت کی قدر مخلوق کو نہیں تو نہیں سہی مگر تجھ پر تو روشن ہے۔ اے خدا یہ لوگ مجھ سے گائے طلب کرتے ہیں، تو نے گائے کیوں بھیجی، اس میں میری کوئی خطا نہیں تھی۔

جب حضرت داؤد علیہ السلام باہر تشریف لائے اور غل غپاڑا سُنا تو پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ مُدّعی نے آگے بڑھ کر عرض کی کہ ای نبی اللہ! میری گائے اس کے گھر میں گھس گئی۔ اس نے میری گائے کو ذبح کرلیا، اب آپ اس سے دریافت کریں کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے پوچھا کہ ای شخص! بتا تو نے اس کی گائے کیوں ذبح کرڈالی واہی تباہی باتیں نہ کر، معقول بات کرتا کہ اس دعوے کا فیصلہ کیا جاسکے۔

اس نے عرض کی کہ ای داؤدؑ! میں سات سال سے دن رات یہی دعا مانگتا تھا کہ ای کریم ورحیم! مجھے روزی حلال بے محنت عطا فرما۔ شہر کی ساری خلقت کیا مرد اور کیا عورت سب واقف ہے۔ اور بچّے تک اس بات کی ہنسی کیا کرتے تھے۔ آپ کسی سے اس کی تصدیق فرمالیں کہ یہ پھٹے کپڑوں والا فقیر سچ کہتا ہے یا نہیں۔ اتنی مُدّت کی دعاؤں کے بعد ایک دن گائے میرے گھر میں آگئی۔ میری آنکھوں میں اندھیری آگئی۔ اس لیے نہیں کہ رزق مل گیا بلکہ اس خوشی میں کہ میری اتنے برسوں کی دعا قبول ہوئی۔ میں نے گائے کو ذبح کردیا کہ خدا کے شکر میں فقیروں پر تقسیم کردوں جس نے میرے دل کی مراد پوری کردی۔

حضرت داؤدؑ نے فرمایا کہ ان باتوں کو چھوڑ اگر کوئی شرعی دلیل ہے تو وہ بیان کر۔ کیا تُو یہ چاہتا ہے کہ میں کسی معقول دلیل کے بغیر ایسا فیصلہ کردوں کہ شریعت میں باطل قانون چل پڑے تجھے وہ گائے کسی نے بخشی یا تو نے خریدی کہ تو اس کا مالک بن گیا؟ بس ایچ پیچ نہ کر، اس مسلمان کو قیمت ادا کر اور اگر پاس نہیں ہے تو قرض لے کر دے۔ اس نے کہا کہ ای بادشاہ تم بھی یہی کہتے ہو جو یہ بے درد کہتے ہیں۔ پھر اس نے سچّے دل سے آہ کی اور کہا کہ ای میرے سوزِ دل کے جاننے والے تو ہی داؤدؑ کے دل میں اس کی روشنی ڈال۔ یہ کہہ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ یہاں تک کہ داؤدؑ کا دل ہل گیا۔ داؤدؑ نے کہا کہ ای گائے والے آج

کے آج مہلت دے اور مقدمہ ملتوی کرتا کہ میں خلوت میں جا کر نماز پڑھوں اور یہ احوال اس راز جاننے والے سے دریافت کروں۔ میرا خلوت میں نماز کے لیے جانا تعلیم خلق کا راستہ ہے۔

پھر حضرت داؤدؑ چپ چاپ تنہائی میں چلے گئے۔ آپ نے دروازہ بند کر دیا اور محراب میں جا کر دعا میں مصروف ہوئے۔ جتنا بتانا تھا خدا نے بتا دیا اور داؤد علیہ السلام اس مقدمے کے طریق سزا سے واقف ہو گئے۔ دوسرے دن مدّعی و مدعا علیہ داؤدؑ کے پاس حاضر ہوئے۔ پھر مقدمہ شروع ہوا اور مدّعی نے سخت گالی گلوچ شروع کی کہ پیغمبرِ برحق کے عہد میں ایسا ظلم صریح ہو رہا ہے کہ گائے کو مار کر کھا گیا اور جواب دہی کے موقع پر اپنی خدا رسی کا فریب دیتا ہے۔ اے خدا کے رسول کیا یہ جائز ہے کہ گائے جو میری ملک تھی وہ خدا نے اسے دے دی حضرت داؤدؑ نے کہا کہ خاموش ہو جا اور اس کا پیچھا چھوڑ اور اس مسلمان کو اپنی گائے معاف کر دے۔ اے جوان جب کہ خدا نے تیرے گناہ کو پوشیدہ کیا ہے تو بھی اس کی ستاری کا حق ادا کر اور صبر کر لے۔ اس نے واویلا مچانی شروع کی کہ یہ کیا حکم اور کیا انصاف ہے کہ مجھ غریب کے لیے نیا قانون وضع ہوا۔ اے داؤدؑ تمھارے عدل و انصاف سے تو زمین و آسمان معطر ہیں لیکن جو ستم مجھ پر ہوا ہے ایسا تو اندھے کتوں پر بھی نہ ہوا ہوگا اس زیادتی سے پتھر اور پہاڑ شق ہو جائیں گے۔ اسی طرح کی شکایتیں علانیہ کر رہا تھا اور ظلم ظلم پکارتا تھا۔ اے نبی اللہ دیکھو مجھ پر ایسا ظلم نہ کرو اور خلافِ انصاف حکم نہ دو۔ حضرت داؤدؑ نے جب سب کچھ سُن لیا تو حکم دیا کہ ارے بدمعاش اپنا سارا مال اس کے حوالے کر ورنہ تیرا معاملہ سخت ہو جائے گا اور تیرا ستم اس پر بھی آشکارا ہو جائے گا۔ اس نے اپنے سر پر خاک اُڑائی، کپڑے پھاڑ لیے اور کہا کہ آپ نے تو ظلم میں اور اضافہ کر دیا۔ جب وہ باز نہ آیا تو حضرت داؤدؑ نے اُس کو اپنے قریب طلب فرمایا اور کہا کہ اے سیاہ بخت چونکہ تیری تقدیر درست نہیں اس لیے تیرے ظلم کا نتیجہ آہستہ آہستہ

ظاہر ہوا۔ دیکھ اس واویلا سے باز آ کہیں یہ واویلا تیری ہلاکت کا پیغام نہ بن جائے
جا تیرے بچے اور بیوی اس کے لونڈی غلام بنا دئے گئے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے پتھر
لے کر اپنا سینہ کوٹنے لگا اور اپنے جہل سے اِدھر اُدھر دوڑنے لگا۔ مخلوق بھی یہ حال
دیکھ کر ترس کھانے لگی کیوں کہ ان احکام کی اصلی وجہ سے ناواقف تھی۔ سب طرف دار
داؤدؑ کے پاس حاضر ہو کر عرض کرنے لگے کہ اے ہمارے شفیق نبی اللہ۔ آپ کی ذات
سے ایسا ظلم نہ ہونا چاہیے۔ آپ نے ایک بے گناہ پہ بے وجہ غصّہ کیا۔ داؤدؑ نے کہا کہ
دوستو! اب وہ وقت آن پہنچا کہ اس کا چھپا ہوا بھید ظاہر ہو۔ سب مل کر ہمارے ساتھ
فلاں جنگل میں دریا کے کنارے چلو بلکہ سب عورت مرد مل کر گھروں سے نکلو تاکہ تم سب
اس پوشیدہ راز سے واقف ہو جاؤ۔ اس جنگل میں ایک بہت بڑا گھنا درخت ہے اس
کی ڈالیوں سے ڈالیاں ملی ہوئی ہیں، وہ بہت تناور درخت ہے۔ مجھے اس کی جڑ میں سے
بوئے خون آتی ہے۔ اس تناور درخت کے نیچے ایک آدمی کا خون کیا گیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اس
بدبخت نے اپنے مالک کو قتل کر کے اس میں ڈال دیا ہے۔ یہ گائے والا دراصل مقتول کا غلام
ہے۔ اس نے اپنے مالک کو قتل کر کے سارا مال لے لیا ہے۔ یہ جوان مدعا علیہ اسی مقتول کا
فرزند ہے، یہ اُس وقت بالکل ناسمجھ بچّہ تھا اس لیے بے خبر ہے۔ اب تک تو خدا کے حلم نے
اس کے ظلم کو پوشیدہ رکھا تھا لیکن آخر میں اس بے حمیت کی ناشکری اس حد کو پہنچی کہ اپنے
مالک کے بچوں کو دیکھنا تک چھوڑ دیا نہ نوروز کو ان سے ملا نہ عید میں جا کر ملاقات کی۔ ان
بے کسوں کو کبھی ایک لقمہ کھانا نہ دیا اور حقوقِ قدیم کو بالکل بھول گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی
کہ ایک ادنیٰ گائے کے لیے اپنے مالک کے بچّے کو زمین پر پچھاڑے ڈالتا ہے، اس
نے اپنے گناہ کا پردہ خود ہی فاش کیا ہے ورنہ شاید خدا اس کے جرم کو چھپا لیتا۔ اس ظلم
کے زمانے میں کافر اور فاسق لوگ اپنا پردہ خود ہی چاک کیا کرتے ہیں۔ ظلم روح کی
گہرائیوں میں چھپا رہتا ہے ظالم اس کو لوگوں میں فاش کرتا ہے۔ جب سب لوگ جنگل میں

اس درخت تک پہنچے تو حضرت داؤدؑ نے حکم دیا کہ مدّعی کے ہاتھ باندھ دیئے جائیں پھر اس سے فرمایا کہ اے کُتّے! پہلے تو نے دادا کو قتل کیا اس کی سزا میں تو مقتول کا غلام بنایا گیا۔ اس کے بعد اپنے مالک کو قتل کر کے تو نے سب مال پر قبضہ کر لیا۔ تیری بیوی اسی مقتول کی لونڈی تھی اس نے بھی اپنے مالک پر جفائیں کی ہیں۔ لہٰذا اب جو لڑکے لڑکیاں اس کے ہاں پیدا ہوں وہ سب اسی مدعا علیہ کی ملک ہیں۔ اور تو بھی اس کا غلام ہے۔ جو کچھ تو نے کمایا سب اس کی ملک ہو گی۔ چونکہ تو نے مطابقِ شرع فیصلہ چاہا تھا لہٰذا یہ تیرا فیصلہ ہے جا اور اس کی تعمیل کر۔ تو نے اپنے مالک کو اسی جگہ بڑی بے دردی سے قتل کیا اور اسی جگہ تیرے مالک نے کیسی کیسی منت سماجت کی۔ اسی جگہ تو نے اپنی چھری پردہ فاش ہونے کے خوف سے زمین میں دفن کر دی تھی۔ اے لوگو زمین کو کھودو دیکھو مالک کا سر چھری کے ساتھ دفن ملے گا اور اس چھری پر اس کتے کا نام بھی کندہ ملے گا۔ جب زمین کھودی گئی تو دیکھا کہ واقعی مقتول کا سر اور وہ چھری زمین میں دفن تھے۔ خلقت میں شور پیدا ہو گیا۔ سب نے حضرت داؤدؑ سے اپنی بدظنی کی معافی مانگی۔ اس کے بعد حضرت داؤدؑ نے حکم دیا کہ اے فریادی آ اور اپنی داد فریاد کا نتیجہ دیکھ۔ پھر اُسی چھری سے قاتل کو قصاص فرمایا۔

خدا کا حلم اگرچہ بہت رعایت کرتا ہے لیکن جب بات حد سے گزر جاتی ہے تو رسوا کر دیتا ہے۔

جب خود مدّعی کے دعوے سے اصل بھید معلوم ہو گیا اور حضرت داؤدؑ کا معجزہ دو ٹوک ثابت ہوا تو ساری خلقت سر برہنہ حاضر ہوئی اور سب نے مل کر بڑی عاجزی سے عرض کی کہ ہم فطرتی اندھے تھے اس لیے آپ نے جو کچھ فرمایا تھا اس کا ہم نے اعتبار نہیں کیا۔ آپ ہمیں معاف فرما دیں۔ ایک ظالم مارا گیا اور ایک جہان زندہ ہو گیا اور ہر شخص کا خدا پر از سر نو ایمان تازہ ہو گیا۔

ای عزیز تو بھی اپنے نفس کو قتل کر کے ایک جہان کو زندہ کر۔ گائے کا مدعی تیرا ہی نفس ہی جس نے اپنے کو امیر اور بڑا آدمی بنا لیا ہی۔ اور وہ گائے کو ذبح کرنے والا تیری عقل ہی۔ تن کی گائے کو ذبح کرنے والے سے مخالفت وانکار نہ کر۔ عقل مقید ہی اور خدا سے ہمیشہ بے رنج و محنت روزی حلال کی طالب ہی۔ تو جانتا ہی کہ خدا کی بے محنت روزی کس کو ملتی ہی؟ اُسے جو گائے یعنی نفس کی خواہش کو ذبح کر دے۔ عقل سلیم اصل وارث بےکس اور بے سر و سامان رہ گئی ہی اور خود غرض، بے درد نفس مالک اور سردار بن گیا۔ تو جانتا ہی کہ روزی بے محنت کیا ہوتی ہی؟ وہ روح کی غذا اور رزقِ پاک ہی لیکن وہ گائے کی قربانی پر موقوف ہی۔ لہٰذا ای جستجو کرنے والے تو گائے کے قتل کو ایک چھپا ہوا خزانہ سمجھ ٭



لڑکوں کا اُستاد کو وہم سے بیمار ڈالنا

ایک مکتب کے لڑکے اُستاد کی سختی سے بہت تنگ آ گئے۔ سب نے مل کر مشورہ کیا کہ کوئی ایسی بات کی جائے کہ اُس کے ظلم سے کچھ تو نجات ملے۔ اس اُستاد کو کوئی بیماری بھی تو نہیں ہوتی کہ چند روز ہم کو آرام رہے۔ اس کی سخت قید اور مار پیٹ سے کوئی بچنے کی صورت نہیں نظر آتی کیوں کہ وہ ظالم تو پتھر کی چٹان کی طرح اپنی جگہ سے نہیں ہلتا۔ آخر ان میں سے ایک ہوشیار لڑکے نے یہ تدبیر نکالی کہ جب اُستاد آئے تو میں کہوں گا کہ حضرت آج آپ کا چہرہ زرد کیوں ہی؟ خیر تو ہی آج آپ کا منہ اُترا ہوا ہی۔ ہو نہ ہو یا تو ہوا لگ گئی ہی یا آپ کو بخار ہی۔ اُستاد کو میرے کہنے کا کچھ خیال ہوگا۔ اس وقت دوسرے بھی میری تائید کریں۔ یعنی دوسرا لڑکا بھی پریشان صورت بنا کر کہے، مولوی صاحب آج آپ کی طبیعت کیسی ہی۔ تب وہ خیال اور دل میں جمے گا۔

اسی طرح تیسرا، چوتھا اور پانچواں یکے بعد دیگرے اپنا فکر اور تشویش ظاہر کریں۔ یہاں تک کہ جب تیس بچّے یک زبان ہو کر یہ خبر دیں گے تو وہ دل میں جگہ پالے گی۔

ہر ایک نے کہا، شاباش اے ذکی خدا تیرا اقبال بلند کرے۔ پھر سب نے اقرار کیا کہ اس تجویز کو کوئی نہ ٹالے گا۔ اس کے بعد اُس نے سب کو قسم دی کہ کوئی اس بات کی چغلی نہ کھائے۔ اس بچّے کی رائے کے سب گرویدہ ہو گئے اس کی عقل چراگاہ میں سب بھیڑوں کے آگے آگے چلتی تھی۔ آدمی کی عقلوں میں بھی وہی فرق ہے جو فرق صورتوں میں ہے۔ غرض دوسرا دن ہوا اور بچّے خوش خوش یہ تجویز گانٹھ کر مکتب پہنچے سب کے سب باہر ہی منتظر کھڑے رہے کہ وہ تجویز نکالنے والا دوست آ جائے کیوں کہ قاعدہ ہے کہ سر پاؤں سے افضل ہوتا ہے۔

وہ بھی آ گیا، اور اُستاد کو سلام کر کے کہا کہ حضرت خیر تو ہے، آپ کے چہرے کا رنگ زرد ہو رہا ہے۔ اُستاد نے کہا کہ مجھے تو کچھ نہیں ہوا تو جا، اور جگہ پر بیٹھ، بے کار باتیں نہ کر۔ استاد نے انکار تو کر دیا مگر برے وہم کا غبار اس کے دل میں آ گیا۔ اسی طرح دوسرے لڑکے نے بھی کہا تو اُستاد کا وہم کچھ اور بڑھا۔ اسی طرح اس کا وہم بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ اسی وہم کی شدت سے وہ بالکل سُست پڑ گیا، کھڑا ہوا اور کمبل اوڑھ لیا۔ دل ہی دل میں اپنی بیوی پر خفا ہونے لگا کہ اس نے بھی مجھ سے کچھ نہ کہا وہ تو اپنے حُسن اور بناؤ سنگھار میں محو رہتی ہے۔ بھلا میری اسے کیا پڑی۔ دل سے باتیں کرتا اپنے دروازے پر پہنچا بہت زور سے دروازہ کھول کر داخل ہوا، اُستاد آگے آگے اور لڑکے پیچھے پیچھے بیوی نے کہا خیر تو ہے اس قدر جلدی کیسے آ گئے۔ اُستاد نے کہا کہ تو اندھی ہو گئی ہے دیکھتی نہیں کہ میں کس قدر علیل ہوں میری دیکھ ریکھ نہیں کرتی۔ بیوی نے کہا کہ میاں تمھیں کوئی بیماری نہیں سارا وہم بے حقیقت ہے۔ اُستاد نے کہا اری تو پھپھڑ دلالے کیوں کرتی ہے، دیکھتی نہیں کہ منہ پہ ہوائیاں اُڑ رہی ہیں اور لرزہ بخار چڑھا ہوا ہے۔ اگر تو اندھی اور بہری ہو گئی ہے

تو اس کو میں کیا کروں، میں تو بیماری اور سخت تکلیف میں مبتلا ہوں ۔ بیوی نے کہا کہ میاں! تم چاہو تو آئینہ لا کر دکھا دوں تاکہ تم کو میری بات کا یقین ہو۔ اُستاد نے کہا اری چل چل تو کیا اور تیرا آئینہ کیا، تو تو ہمیشہ کا مجھ سے بغض رکھتی ہے۔ جا میرا بچھونا بچھا دے تاکہ میں ذرا سو جاؤں کیونکہ میرا سر بھاری ہو رہا ہے۔ بیوی ذرا سوچ میں پڑی، تو اُستاد نے فوراً للکار کر کہا، اری او بیری دشمن جلدی کر۔

الغرض بچھونا لا کر اس نے بچھا دیا، اگرچہ دل میں بہت جل رہی تھی کہ اگر اب میں اس کے خلاف کچھ کہتی ہوں تو بگڑتا ہے اور اگر چُپ رہتی ہوں تو یہ ایک مضحکہ ہوا جاتا ہے۔ بہر حال اُستاد صاحب لیٹ کر کراہنے لگے۔ لڑکے سب وہاں جا بیٹھے اور بظاہر سبق پڑھنے لگے مگر کچھ تو پشیمان تھے کہ یہ بری حرکت ہم سے ہوئی اور کچھ اس فکر میں تھے کہ اب یہاں سے کس طرح چھٹکارا نصیب ہو۔ اس عقلمند لڑکے نے کہا کہ ای بھائیو! خوب خوب پکار پکار کر سبق پڑھو، اور جب سب بچے پکار پکار کر پڑھنے لگے تو اسی لڑکے نے پکار کر کہا کہ ارے بھئی کہیں ہماری آواز سے حضرت کو تکلیف نہ پہنچتی ہو۔ اُستاد نے بھی کہا ہاں یہ سچ کہتا ہے، جاؤ، چھٹی، میرے سر میں درد بڑھ گیا، تم گھروں کو جاؤ۔ سب لڑکوں نے اُستاد کو جھک جھک کر سلام کیے اور اُچھلتے کودتے اپنے گھر پہنچے جیسے پرندے دانے پر ٹوٹ کر گرتے ہیں۔ بچوں کی ماؤں نے خفا ہو کر کہا کہ ہائیں آج تو پڑھنے کا دن ہے اور تم کو کھیل سوجھا ہے۔ یہ وقت تو پڑھنے لکھنے کا ہے اور تم مکتب اور اُستاد سے بھاگے ہوئے ہو، ہر بچے نے جواب دیا کہ اماں جان ہماری خطا نہیں ہے۔ خدا کی قدرت سے ہمارے اُستاد کی طبیعت خراب ہے اور وہ بستر پر پڑ گئے ہیں۔ ماؤں نے اس کا یقین نہیں کیا اور دوسرے دن صبح خود اُستاد کے مکان پر گئیں۔ دیکھا تو واقع میں وہ لحاف اوڑھے، پرانے بیمار کی طرح پڑا ہائے ہائے کر رہا ہے۔ عورتوں کو بڑی حیرت ہوئی اور دریافت کیا کہ حضرت کیا حال ہے آپ تو کل تک بالکل اچھے تھے۔ یہ ایکا ایکی آپ

کو کیا ہو گیا۔ اُستاد نے کہا، ہاں مجھے بھی اپنے کام کی دُھن میں کچھ خبر نہ تھی کہ ایسی سخت بیماری اندر ہی اندر پل رہی ہے مجھے تو کل ان بچّوں نے آگاہ کیا کہ میں کس قدر بیماری میں مبتلا ہوں۔ یہ سُن کر عورتوں نے لاحول پڑھی اور یہ کہہ کر کہ ایسی بیماری کا علاج کسی کے پاس نہیں گھروں کو واپس گئیں +



ایک زاہد کا بے قراری میں اپنا عہد توڑ دینا

میں ایک حکایت بیان کرتا ہوں اگر تم غور کرو تو حقیقت پر فریفتہ ہو جاؤ۔ ایک درویش پہاڑیوں میں رہتا تھا۔ تنہائی ہی اس کے جورو بچّے تھے اور تنہائی ہی اس کی مصاحب تھی۔ پروردگار کی جانب سے اس کو مستانہ خوشبوئیں پہنچتی تھیں اس لیے وہ لوگوں کے سانس کی بدبو سے پریشان ہوتا تھا۔

بات یہ ہے کہ جس طرح آرام سے گھر میں مقیم رہنا ہمیں اچھا لگتا ہے اسی طرح دوسرے گروہ پر سفر آسان کر دیا گیا ہے۔

القصہ اس پہاڑ کی وادیوں میں پھل دار درخت سیب امرود اور انار کے بہت تھے۔ اس درویش کی غذا وہی میوے تھے۔ ان کے سوا اور کچھ نہ کھاتا تھا۔ ایک مرتبہ درویش نے خدا سے عہد کیا کہ اے میرے پالنے والے میں ان درختوں سے خود میوہ نہ توڑوں گا نہ کسی اور سے توڑنے کی درخواست کروں گا۔ میں وہ میوہ نہ کھاؤں گا جس کو ڈالیاں بلند رکھیں، صرف وہی میوہ کھاؤں گا جو ہوا کے جھونکے سے جھڑ پڑے اتفاقاً پانچ دن تک کوئی سیب یا امرود ہوا سے نہیں جھڑا اور بھوک کی آگ نے درویش کو بے قرار کر دیا۔ ایک ڈالی کی پھننگ پر چند امرود لگے ہوئے دیکھے مگر پھر بھی صبر کیا اور اپنے کو قابو میں رکھا۔ اتنے میں ہوا کا جھکڑ ایسا آیا کہ شاخ کی

پھننگ نیچے کو جُھک گئی پھر طبیعت قابو میں نہ رہی۔ بھوک نے آخر زاہد کو عہد توڑنے پر آمادہ کر دیا اور درخت سے میوہ توڑنا تھا کہ اس کا عہد ٹوٹ گیا۔ ساتھ ہی خدا کی غیرت نے حرکت کی کیوں کہ خدا کا فرمان ہی کہ جو عہد باندھو اس کو ضرور پورا کرو۔ اسی پہاڑ میں شاید پہلے بھی چوروں کی جماعت رہتی اور وہیں چوری کا مال آپس میں تقسیم کیا کرتی تھی۔ اتفاقاً اسی وقت ان کے وہاں موجود ہونے کی خبر پاکر کوتوالی کے سپاہیوں نے اس پہاڑی کا محاصرہ کرلیا اور چوروں کے ساتھ درویش کو بھی گرفتار کر کے ہتکڑی بیڑی ڈال دی اس کے بعد کوتوال نے جلّاد کو حکم دیا کہ ہر ایک کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے۔ جلاد نے وہیں بایاں پاؤں اور دایاں ہاتھ سب کا کاٹ ڈالا۔ اب کیا تھا شور و واویلا سے سارا پہاڑ گونج اُٹھا۔ انھی میں درویش کا ہاتھ بھی کاٹ ڈالا گیا اور پاؤں کاٹ دینے کا انتظام ہو رہا تھا کہ ناگاہ ایک سوار گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا اور سپاہیوں کو للکار کر کہا کہ ارے کتو! دیکھو یہ فلاں شیخ اور خدا کے ابدال سے ہیں ان کا ہاتھ کیوں کاٹ ڈالا۔ یہ سُن کر سپاہی نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے اور تیزی سے کوتوال کی حضور پہنچ کر اس واقعہ سے آگاہ کیا۔ کوتوال یہ سُن کر ننگے پاؤں معذرت کرتا ہوا حاضر ہوا کہ ای حضرت! معاف فرمائیے، خدا گواہ ہی کہ مجھے خبر نہ تھی۔ ای بخشش کرنے والے اہلِ بہشت کے سردار! میں نے سخت گناہ کیا آپ مجھے بخش دیجیے۔ انھوں نے فرمایا کہ میں اس تکلیف کا سبب جانتا ہوں اور میں اپنے گناہ سے خود واقف ہوں۔ میں نے ایمان داری کی عزت برباد کردی اس لیے میرے ہی عہد نے مجھے اس کی کچہری میں دھکیل دیا۔ میں نے جان بوجھ کر عہد توڑا! اس لیے سزا میں ہاتھ پر آفت آئی۔ ہمارا ہاتھ ہمارا پاؤں اور ہمارا جسم و جان، دوست کے حکم پر نثار ہو جائے تو یہ شکر کا مقام ہی۔ تجھ سے مجھے کوئی شکایت نہیں۔ تجھے کیا خبر تھی، لہٰذا تجھ پر کوئی آفت نہ آئے گی۔ جو غلبۂ فرمانروائی سے واقف ہی اسے خدا سے اُلجھنے کی کیا مجال ہی۔

اب درویش کی کرامت سنو کہ ہاتھ کٹنے کے بعد لوگوں میں ان کا نام ٹنڈے شیخ پڑ گیا تھا۔ لوگ اسی لقب سے ان کو پکارتے تھے۔ اتفاقاً ایک شخص بغرضِ ملاقات ان کی جھونپڑی میں گھس آیا دیکھا کہ حضرت دونوں ہاتھوں سے اپنی جھولی سی رہے ہیں۔ شیخ نے کہا کہ ارے جان کے دشمن تو میری جھونپڑی میں بے اطلاع منہ ڈال کر کیسے آ گیا۔ اس نے عرض کی محبت اور اشتیاق کی وجہ سے غلطی ہو گئی۔ شیخ نے فرمایا کہ اچھا تو چلا آ، لیکن خبردار یہ حال لوگوں سے مخفی رکھنا۔ جب تک میں مر نہ جاؤں اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا لیکن جھونپڑی کے باہر ایک مجمع کثیر جھانک رہا تھا وہ شیخ کے جھولی سینے پر واقف ہو گیا۔ شیخ نے دل میں کہا کہ اے پروردگار اس کی حکمت تو ہی جانتا ہے کہ میں اس کرامت کو چھپاتا ہوں اور تو اس کو ظاہر کرتا ہے۔ شیخ کو الہام ہوا کہ قریب تھا کہ لوگ تجھ سے منکر ہو جائیں اور کہتے پھریں کہ تو راہِ خدا میں مکر کا جال پھیلا کر بیٹھا تھا اس لیے خدا نے اس کو بدنام و رسوا کیا۔ ہم کو منظور نہ ہوا کہ وہ لوگ کافر ہو جائیں اور اپنی گمراہی سے بدگمانی میں پڑیں اس لیے ہم نے تیری یہ کرامت ظاہر کر دی کہ کام کے وقت میں ہم تجھے ہاتھ عطا کر دیتے ہیں تاکہ یہ بدگمانی کے روگی درگاہِ الٰہی سے پھر نہ جائیں۔ میں تو ان کرامتوں سے پہلے بھی تجھے اپنی ذاتِ خاص کا عرفان دے چکا ہوں۔ یہ کرامت جو تجھ کو عطا ہوئی یہ ان عوام کے لیے ہے اور یہ چراغ اس مصلحت سے روشن کیا گیا ہے۔



ایک شخص کا سنار سے ترازو مانگنا اور سنار کا جواب

ایک آدمی سنار کے پاس سونا تولنے کے لیے ترازو مانگنے آیا۔ سنار نے کہا کہ میاں اپنا رستہ لو میرے پاس چھلنی نہیں ہے، اس نے کہا کہ ہائیں مذاق نہ کرو بھائی مجھے ترازو چاہیے۔ اس نے جواب دیا کہ میری دکان میں جھاڑو ہی نہیں، اس نے کہا ارے بھائی

مسخرے پن کو چھوڑ۔ میں تو ترازو مانگتا ہوں، وہ دے اور بہرا بن کے اونگے بونگے جواب نہ دے۔ سُنار نے جواب دیا کہ حضرت میں نے تمھاری بات سُن لی تھی، میں بہرا نہیں ہوں، تم یہ نہ سمجھو کہ میں مہمل بک رہا ہوں۔ تم بوڑھے آدمی سوکھ کر قاق ہو رہے ہو ہاتھوں میں رعشہ ہے اور سارا جسم کانپتا ہے۔ تمھارا سونا بھی کچھ بُرادہ اور کچھ چورا ہے اس لیے تولتے میں ہاتھ لرزے گا اور سونا گر پڑے گا۔ تو پھر تم آؤ گے کہ بھائی ذرا جھاڑو تو لے آ تاکہ میں اپنا سونا اکٹھا کروں اور جب جھاڑ کر مٹی خاک ایک جگہ جمع کر لو گے تو پھر کہو گے کہ مجھے چھلنی چاہیے۔ تاکہ خاک کو چھان کر سونا الگ کروں اور ہماری دوکان میں چھلنی کہاں۔ میں نے پہلے ہی سے تمھارے کام کا انجام دیکھ کر کہا تھا لہٰذا آپ کہیں اور ترازو مانگنے جائیے۔

جو صرف آغاز کو دیکھتا ہے وہ اندھا ہے۔ جو انجام پر نظر رکھے وہ عقل مند ہے۔ جو شخص کہ پہلے ہی سے پیش آنے والی بات کو سوچ لے وہ آخر پر کبھی شرمسار نہیں ہوتا۔



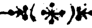
حضرت عیسیٰؑ کا احمقوں سے ڈر کر بھاگنا

حضرت عیسیٰؑ ایک دفعہ پہاڑ کی طرف بے تحاشا جا رہے تھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ شاید کوئی شیر ان پر حملہ کرنے کے لیے پیچھے آ رہا ہے۔ ایک شخص حضرت کے پیچھے دوڑا، پوچھا کہ خیر تو ہے حضرت! آپ کے پیچھے تو کوئی بھی نہیں پھر پرندے کی طرح کیوں اُڑے چلے جا رہے ہیں۔ مگر حضرت عیسیٰؑ نے اپنی تیز روی میں، اس کو کوئی جواب نہ دیا۔ ایک دو میدان تک تو وہ پیچھے پیچھے دوڑا آخر کار بڑے زور کی آوازیں دے کر عیسیٰؑ کو پکارا کہ خدا کے واسطے ذرا تو ٹھیریے کہ مجھے آپ کی اس بھاگ دوڑ سے خلجان پیدا ہو گیا ہے۔ آپ ادھر سے کیوں بھاگے جا رہے ہے

ہیں، آپ کے پیچھے نہ کوئی شیر ہے نہ کوئی دشمن۔ آپ نے فرمایا کہ سچ ہے۔ مگر ایک احمق آدمی سے بھاگ رہا ہوں۔ تو میرا راستہ کھوٹا نہ کر۔ اس نے کہا ہائیں کیا تم مسیحا نہیں ہو جن سے اندھے اور بہرے بینا اور شنوا ہو جاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ پھر اس نے پوچھا کہ آپ وہ بادشاہ نہیں جو طلسم غیب پر قدرت رکھتا ہے، کہ اگر تم مردے پر پڑھ دو تو وہ مردہ زندہ گرفتار کیے ہوئے شیر کی طرح اُٹھ آتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں میں وہی ہوں۔ پھر اس نے پوچھا کہ آپ وہ نہیں کہ مٹی کا پرندہ بنا کر اس پر ذرا دم کریں تو جان دار ہو جائے اور اسی وقت ہوا میں اُڑنے لگے۔ آپ نے جواب دیا کہ بے شک، پھر اس نے عرض کی کہ ای روح پاک، آپ جو چاہے کر سکتے ہیں۔ پھر آپ کو کس کا ڈر ہے۔ حضرت مسیحؑ نے فرمایا کہ خدا کی قسم جو جسم کا ایجاد کرنے والا اور جان کا پیدا کرنے والا ہے۔ اس کی ذات و صفات کی عزّت کے آگے آسمان بھی گریبان چاک ہے کہ اس طلسم و اسم اعظم کو میں نے بہروں اور اندھوں پر پڑھا تو وہ اچھے ہو گئے۔ پہاڑوں پر پڑھا تو وہ شق ہو گئے۔ جسم مردہ پر پڑھا تو وہ زندہ ہو گیا، لاشی پر پڑھا تو وہ شی ہو گیا۔ لیکن میں نے کس کس خلوص و کوشش سے وہی طلسم احمق پر پڑھا اور لاکھوں بار پڑھا مگر افسوس کہ کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اُس نے حیرت سے پوچھا کہ حضرت یہ کیا بات ہے کہ خدا کا نام وہاں فائدہ کرتا ہے اور یہاں بے اثر ہے حالانکہ یہ بھی ایک بیماری ہے اور وہ بھی، پھر کیا سبب ہے کہ اسم اعظم دونوں پر یکساں اثر نہیں کرتا۔ حضرت عیسیٰؑ نے کہا کہ احمقی کی بیماری خدا کا غضب اور اندھے پن کی بیماری غضب نہیں بلکہ آزمائش ہے۔ آزمائش سے جو بیماری ہو اُس پر رحم آتا ہے اور احمقی وہ بیماری ہے کہ اس سے زخم آتا ہے۔

ای شخص! تو بھی حضرت عیسیٰؑ کی طرح احمقوں سے دور بھاگ، نادان کی صحبت نے بڑے بڑے فساد کیے ہیں۔ جس طرح کہ ہوا آہستہ آہستہ پانی کو خشک کر دیتی

ہو اسی طرح احمق بھی آہستہ آہستہ نامحسوس طور پر تم کو چُرا لیتا ہی۔ تیری گرمی کو چرا کر سردی دیتا ہی جیسے ٹھنڈے پتھر سے تیرے سارے بدن میں سردی پیدا ہو جاتی ہی۔ مگر حضرت عیسےٰؑ کا احمق سے بھاگنا کسی خوف و خطر سے نہ تھا کیوں کہ آپ ہر قسم کی آفت واثر سے محفوظ تھے بلکہ وہ امّت کی تعلیم کے لیے تھا ورنہ کوہِ زمہریر ساری دنیا میں سردی پھیلا دے تو بھی خورشیدِ تاباں کو کیا غم +



دور بیں اندھا، تیز سننے والا بہرا، اور دراز دامن ننگا

بچّے بہت سے من گھڑت قصّے کہتے ہیں ان کہانیوں اور پہیلیوں میں بہت سے راز اور نصیحتیں ہوتی ہیں اور فضول باتیں بھی۔ لیکن تو انہی ویرانوں میں سے خزانہ تلاش کر۔ ایک بڑا گنجان شہر تھا۔ کوئی دس شہروں کے آدمی اس ایک شہر میں آباد تھے لیکن وہ سب کے سب تین ہی قسم کے نادان تجربہ کار تھے۔ ایک تو وہ کہ دور کی چیز دیکھتا تھا مگر آنکھوں سے اندھا تھا۔ حضرت سلیمانؑ کے دیدار سے تو اس کی آنکھیں بے نصیب تھیں لیکن چیونٹی کے پاؤں دیکھ لیتا تھا۔ دوسرا بہت تیز سننے والا مگر بالکل بہرا تھا اور تیسرا جِسم ننگا جیسے چلتا پھرتا ہوا مُردہ لیکن اس کے کپڑوں کے دامن بہت لمبے لمبے تھے۔

اندھے نے کہا دیکھو ایک گروہ آرہا ہی، میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ کون سی قوم ہی اور اس میں کتنے آدمی ہیں۔ بہرے نے کہا کہ ہاں میں نے بھی ان کی باتوں کی آواز سنی۔ ننگے نے کہا کہ بھائی مجھے یہ ڈر لگ رہا ہی کہ کہیں میرے لمبے لمبے دامن نہ کتر لیں۔

اندھے نے کہا کہ دیکھو! وہ لوگ نزدیک پہنچ گئے، ارے جلدی اُٹھو، مار پیٹ

یا پکڑ دھکڑ سے پہلے ہی نکل بھاگیں۔ بہرے نے کہا کہ ہاں ان کے پیروں کی چاپ نزدیک ہوتی جاتی ہے، اے دوستو! ہوشیار ہو جاؤ۔ ننگے نے کہا کہ بے شک بھاگو کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ میرا دامن کتر لیں میں تو بالکل ہی خطرے میں ہوں۔

الغرض تینوں شہر سے بھاگ کر باہر نکلے اور بھاگ کر ایک گانوں میں پہنچے اس گانوں میں انھوں نے خوب موٹا تازہ مرغ پایا لیکن بالکل ہڈیوں کی مالا کہ ذرا سا بھی گوشت اس میں نہ تھا۔ اندھے نے اسے دیکھا۔ بہرے نے اس کی آواز سنی اور ننگے نے پکڑ کر اپنے دامن میں لے لیا۔ وہ مرغ مر کر خشک ہو گیا تھا اور کوّے نے اس میں چونچیں ماری تھیں۔ ان تینوں نے ایک دیگ منگوائی جس کا نہ دہانہ تھا نہ پیندا بس اسی کو چولھے پر چڑھا دیا۔ ان تینوں نے وہ موٹا تازہ مرغ دیگ میں ڈالا اور پکانا شروع کیا اور اتنی آنچ دی کہ ساری ہڈیاں گل کر حلوا ہو گئیں پھر جس طرح شیر اپنا شکار کھاتا ہے اس طرح ان تینوں نے وہ مرغ کھایا اور ہر ایک نے ہاتھی کی طرح سیر ہو کر کھایا۔ وہ تینوں اس ایک مرغ کو کھا کر بہت بڑے گراں ڈیل ہاتھی کی طرح موٹے تازے ہو گئے۔ ان کا مٹاپا اتنا بڑھا کہ ہر ایک چوڑے چکلے پن کی وجہ سے جہاں میں نہ سماتا تھا۔ مگر اس مٹاپے کے باوجود وہ دروازے کے سوراخ میں سے نکل جاتے تھے۔

مخلوق کو ہَوکا ہو گیا ہے کہ دنیا کی ہر شے پیٹ میں اُتار لے اور کھا کھا کر خوب موٹی ہو جائے خواہ وہ چیز جو ظاہر میں چرب اور اچھی نظر آتی ہے حقیقت میں کیسی ہی گندی اور ناجائز کیوں نہ ہو، اسے اپنا پیٹ بھرنے سے کام ہے لیکن دوسری طرفہ تر بات یہ ہے کہ اسے موت کے راستے پر چلے بغیر چارہ نہیں اور یہ وہ عجیب راستہ ہے کہ دکھائی نہیں دیتا ایک کے پیچھے ایک قافلے کے قافلے دروازے کے روزن سے نکلے چلے جاتے ہیں اور وہ روزن دکھائی نہیں دیتا بلکہ خود اس دروازے کا پتہ نہیں چلتا جس کے روزن سے

یہ قافلہ گزرا چلا جاتا ہے۔ اس قصّے میں امید کی مثال بہرے کی ہے کہ ہماری موت کی خبر تو سنتا ہے مگر اپنی موت کی خبر نہ سنتا ہے نہ اپنے کو گزرتا ہوا دیکھتا ہے۔ حرص کی مثال اندھے کی ہے کہ مخلوق کے ذرا ذرا سے عیب کو دیکھتا ہے اور کوچہ بہ کوچہ تشہیر کرتا ہے۔ لیکن اس کی اندھی آنکھ اپنا عیب ذرّہ برابر بھی نہیں دیکھتی۔ اور ننگا ڈرتا ہے کہ کہیں اس کا دامن نہ کتر لیں تو بھلا ننگے کے پاس دھرا ہی کیا ہے جو اس کا دامن کترا جائے گا۔ یہ دنیا دار شخص ہے کہ دنیا میں ننگا آیا ہے اور ننگا ہی جاتا ہے مگر ساری عمر چور کے غم میں اس کا جگر خون رہتا ہے۔ ایسا آدمی اپنی موت کے وقت اور بھی واویلا مچاتا ہے لیکن اس وقت خود جان خوب ہنستی ہے کہ زندگی میں یہ شخص کس چیز کا خوف کھایا کرتا تھا۔ اس گھڑی روپئے والے کو تو معلوم ہوتا ہے کہ در اصل وہ بالکل مفلس تھا اور صاحبِ حس کو پتہ چلتا ہے کہ زندگی کیسی بے ہنری میں گزری۔

سارے علوم کی جان یہ ہے کہ تو جانے کہ اُس باز پرس (قیامت) کے دن تیرا درجہ کیا ہوگا۔ اپنی اصل پر غور کر جو تیرے سامنے ہے۔ علمِ اصول یا معقولات جاننے سے بہتر ہے کہ تو اپنی اصلیت کو جانے ✦



غلام جو مسجد سے باہر نہ آتا تھا

کسی امیر کا غلام سنقر نام گزرا ہے۔ ایک روز پچھلی رات کو امیر نے سنقر کو آواز دی اور کہا چل کھڑا ہو۔ پیالہ، پٹکا، پنڈول کی مٹی لونڈی سے لے تاکہ آج بہت صبح حمام میں پہنچ جائیں۔ سنقر حاضر ہوا، پیالہ اور عمدہ پٹکا لیا اور دونوں کے دونوں چل دیے۔ راستے میں ایک مسجد سے نماز فجر کی اذان کی آواز آئی۔ سنقر نماز کا پابند تھا۔ اس نے کہا کہ سرکار! آپ ذرا اس دوکان پر ٹھیر جائیں، میں نماز ادا کر لوں۔ سنقر تو نماز کو گیا اور وہ خدا سے غافل امیر دُکان پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ بہت دیر ہوگئی یہاں تک کہ امام اور سارے نمازی اپنی نماز اور

ورد و وظائف سے فارغ ہو کر باہر آئے مگر سنقر باہر نہ آیا۔ امیر نے پکارا کہ سنقر باہر کیوں نہیں آتا۔ سنقر نے جواب دیا کہ پیر و مرشد مجھے آنے نہیں دیتے۔ ذرا ٹھیریئے ابھی آیا، میں آپ کی آواز سے غافل نہیں ہوں۔ اس طرح سات بار آواز دیتا اور انتظار کرتا رہا یہاں تک کہ ٹھیرو، ٹھیرو کے جواب سے تنگ آگیا۔ وہ بار بار یہی جواب دیتا تھا کہ مجھے چھوڑ نہیں رہے ہیں کہ باہر آؤں۔ امیر نے کہا کہ مسجد تو خالی ہو چکی تجھے وہاں کون روک رہا ہے۔ سنقر نے کہا کہ وہی جس نے آپ کو اندر آنے سے روکا ہے اسی نے مجھ کو اندر سے باہر آنے کو روک رکھا ہے۔

ای فرزند مچھلیوں کو سمندر باہر نکلنے نہیں دیتا اور خشکی کے جانوروں کو اپنے اندر آنے نہیں دیتا۔ مچھلی کی اصل پانی اور چوپائے کی مٹی ہے اس لیے یہاں کوئی حیلہ و تدبیر نہیں چلتی ایسا قفل سخت پڑ جائے تو اس کو خدا ہی کھولے تو کھل سکتا ہے۔

ایک شہباز کا حضرت رسول اللہؐ کا موزہ اڑا لے جانا

ایک بار شہر کے باہر کسی میدان میں اذان کی آواز حضرت مصطفٰےؐ نے عالم بالا سے آتی ہوئی سُنی۔ آپ نے پانی طلب فرما کر وضو تازہ کیا۔ وضو کے بعد آپ اپنا موزہ لینے کے لیے ہاتھ بڑھا ہی رہے تھے کہ ایک شہباز نے جھپٹا مار کر موزہ اُڑا لیا۔ وہ موزہ لے کر ہوا میں بلند ہو گیا اور وہاں سے جو موزے کو اُلٹا تو اُس میں سے ایک سانپ نیچے گرا۔ جب دیکھا کہ کالا ناگ اس میں سے گرا ہے تو شہباز کی خیر خواہی ثابت ہوئی۔ پھر شہباز اس موزے کو واپس لایا اور عرض کی کہ لیجیے اور نماز کا ارادہ کیجیے۔ میں نے یہ گستاخی بضرورت کی تھی۔ پس حضرت رسولؐ نے شکرِ خدا ادا فرمایا اور کہا ہم اس شہباز کی زیادتی سمجھے تھے مگر وہ اس کی وفاداری نکلی۔ آپ نے فرمایا کہ تو نے تو میری تکلیف

دور کی تھی مگر میں اُلٹا تجھ سے رنجیدہ ہو گیا تھا۔ اگرچہ خدا نے ہر عیب پر ہم کو آگاہ کیا ہے لیکن اس وقت ہمارا دل اپنے آپ میں مشغول تھا۔ شہباز نے عرض کی کہ خدا نہ کرے کہ آپ سے غفلت سرزد ہو، میرا غیب پر مطلع ہونا بھی آپ کے عکس پڑنے سے تھا بھلا میں اس قدر بلندی سے موزے کے چھپے ہوئے سانپ کو دیکھ لوں، یہ مجھ سے ممکن نہیں، اے مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم یہ آپ ہی کا عکس ہے۔ نور کا عکس بھی روشن ہوتا ہے اور تاریکی کا عکس تاریک ہوتا ہے +

ایک شخص کا موسیٰؑ سے چوپایوں کی زبان سیکھنا

حضرت موسیٰؑ سے ایک نوجوان نے جانوروں کی زبان سیکھنے کی خواہش کی تاکہ وحشی و اہلی جانوروں کی آوازوں سے خدا کی اور معرفت حاصل کرے کیوں کہ بنی آدم کی ساری زبانیں تو کھانے پانی اور مکر وفریب ہی کے کام میں لگی رہتی ہیں۔ ممکن ہے جانور اپنی شکم پُری کی اور کچھ تدبیریں کرتے ہوں۔ موسیٰؑ نے کہا کہ اس ہوس سے باز آ کیوں کہ اس میں طرح طرح کے خطرے ہیں۔ بجائے کتاب و گفتار کے معرفت، خدا سے طلب کر۔

مگر جس قدر حضرت نے اس کو منع کیا اسی قدر اس کا شوق زیادہ ہو گیا اور قاعدہ ہے کہ جس بات کو منع کیا جائے اُسی کی رغبت بڑھ جاتی ہے۔ اس نے عرض کی کہ یا حضرت جب سے آپ کا نور چمکا ہے ہر چیز کی استعداد کھل گئی ہے۔ مجھے اس مقصد سے محروم کرنا آپ کی مہر و محبت سے دور ہے۔ آپ خدا کے قائم مقام ہیں اگر مجھے اس تحصیل سے روک دیں تو میں مایوس ہو جاؤں گا۔ حضرت موسیٰؑ نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کی کہ اے خدائے بے نیاز معلوم ہوتا ہے کہ اس عقل مند آدمی کو شیطانِ مردود نے کھلونا بنا لیا ہے۔

اگر اسے میں سکھا دوں تو اس کے ساتھ بُرائی ہوتی ہے اور اگر نہ سکھاؤں تو اس کے دل کو صدمہ پہنچتا ہے۔ خدا کا حکم ہوا کہ اے موسیٰ! تم اسے سکھاؤ۔ کیوں کہ ہم نے اپنے کرم سے کبھی کسی کی دعا رد نہیں کی ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے جا کر بہت نرمی سے اسے سمجھایا کہ تیری مراد تو اب خود بخود حاصل ہو جائے گی لیکن بہتر ہے کہ تو خدا سے ڈرے اور اس خیال سے باز آئے کیوں کہ شیطان نے یہ پٹی تجھے پڑھائی ہے۔ مفت کا دردِ سر مول نہ لے کیونکہ یہ تحصیل تجھ کو ہزار آفتوں میں پھنسا دے گی۔ اس نے عرض کی کہ بہت اچھا، سارے جانوروں کی بولی نہ سہی، کتّے کی بولی جو میرے دروازے پر رہتا ہے اور مرغ کی بولی جو گھر میں پلا ہے میں جان لوں تو یہی کافی ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے فرمایا کہ اچھا لے آج سے ان دونوں کی بولی کا علم تجھ پر کھول دیا گیا۔

صبح سویرے وہ آزمایش کے لیے اپنے دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ ماما نے دستر خوان جو بچھایا تو ایک باسی روٹی کا ٹکڑا کھانے سے بچ رہا تھا وہ نیچے گر پڑا۔ مرغ تو تاک میں لگا ہوا ہی تھا وہ فوراً اُڑا لے گیا۔ کتّے نے شکوہ کیا کہ تو تو کچے گیہوں بھی چُگ سکتا ہے میں دانہ دنکا نہیں چُگ سکتا۔ اے دوست یہ ذرا سا روٹی کا ٹکڑا جو دراصل ہمارا حصہ ہے وہ بھی تو ہی اُڑا لیتا ہے۔ مرغ نے یہ سُن کر کہا کہ ذرا صبر کر اور اس کا افسوس نہ کر، خدا تجھ کو اس سے زیادہ اچھا بدلا دے گا۔ کل ہمارے مالک کا گھوڑا مر جائے گا پھر خوب پیٹ بھر کر کھائیو۔ گھوڑے کی موت کتّوں کی عید ہے، بے کوشش و محنت خوب رزق میسّر آتا ہے۔

یہ سنتے ہی مالک نے گھوڑا لے جا کر بیچ ڈالا اور دوسرے دن جو دسترخوان بچھا تو مرغ پھر روٹی کا ٹکڑا اُڑا لے گیا اور کُتّے نے پھر شکایت کی کہ اے باتونی مرغ! تو کیسا جھوٹا ہے۔ ارے ظالم تو نے کہا تھا کہ گھوڑا مر جائے گا، گھوڑا کہاں مرا، تو سیاہ بخت سچائی سے محروم ہے۔ باخبر مرغ نے جواب دیا کہ وہ گھوڑا دوسری جگہ مر گیا۔ مالک

گھوڑا بیچ کر نقصان سے بچ گیا اور اپنا نقصان دوسروں پر ڈال دیا لیکن کل اس کا اونٹ مرجائے گا تو پھر کتّوں کے گھرے ہیں۔

یہ سن کر فوراً مالک نے اونٹ کو بھی بیچ ڈالا، اور مرنے کے غم اور نقصان سے نجات پائی۔ تیسرے دن کتّے نے مرغ سے کہا، اے جھوٹوں کے بادشاہ! کب تک جھوٹ بولے جائے گا، ارے نا اہل تو تو بالکل ہی فریبی دلال ہے۔ مرغ نے کہا کہ اس نے جلدی کرکے اونٹ کو بیچ ڈالا لیکن کل اس کا غلام مرے گا اور اس کے اقربا حاضری کی روٹیاں فقیروں کو دیں گے اور کتّوں کو بھی خوب ملیں گی۔ یہ سنتے ہی مالک نے غلام کو بھی بیچ دیا اور نقصان سے بچ کر بہت خوش ہوا۔

وہ خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا اور شکر پر شکر کرتا تھا کہ میں تابڑ توڑ تین حادثوں سے بچ گیا۔ جب سے مجھے مرغ اور کتّے کی بولیاں آگئی ہیں جب سے میں نے فرشتۂ قضا کی آنکھیں بیٹم کردی ہیں۔

چوتھے دن اس بے آس کتّے نے کہا کہ اے بڑ بولے، فضول گو مرغ وہ تیری پیشین گوئیاں کیا ہوئیں۔ یہ تیرا مکر و فریب کب تک چلے گا تیرے ٹاپے سے تیرا جھوٹ باہر نکلا کرتا ہے۔ اس نے کہا توبہ توبہ، میں اور میری قوم اور ذلیل جھوٹ بولے، بھلا یہ کب ہو سکتا ہے۔ ہماری قوم موذّن کی طرح راست گفتار ہے۔ اصل یہ ہے کہ وہ غلام خریدار کے پاس جاکر مرگیا اور خریدار کا نقصان ہوا۔ مالک نے خریدار کا مال تو برباد کرایا لیکن خوب سمجھ لے کہ اب خود مالک کی جان پر آبنی۔ ایک نقصان سینکڑوں نقصانوں کو دفع کردیتا ہے، جسم و مال کا نقصان جان کا صدقہ ہوجاتا ہے۔ بادشاہوں کی عدالت میں تو مال کا جرمانہ ادا کرکے اپنی جان بچا لیتا ہے۔ مگر قضائے الٰہی کے بھید سے ناواقف ہے کہ اپنے مال کو بچاتا ہے حالانکہ اگر وہی مال تجھ پر سے صدقے ہوجائے تو وہی نقصان تیرا فائدہ بن جائے۔ اب کل یقیناً خود مالک ہی مرجائے گا اور

اس کے ورثہ فاتحہ میں گائے قربانی کریں گے ۔ لے پھر تو خوب مزے مزے کے مال اُڑائیو ۔ روٹیاں ، دسترخوان کا جھوٹا اور قسم قسم کے لذیذ کھانے ، گائے کے گوشت کا قورمہ اور چپاتیاں فقیروں مسکینوں سے لے کر کتوں تک کو ڈالی جائیں گی ۔ گھوڑے اور اونٹ اور غلام کی موت اس بے وقوف مغرور کی جان کا بدلہ تھا ۔ مال کے نقصان اور اس کے غم سے تو بچ گیا اور مال بھی جمع کر لیا لیکن اپنی جان گنوائی ۔

مالک مرغ کی پیشین گوئی کو کان لگا کر سن رہا تھا ۔ یہ سنتے ہی حضرت موسیٰ کلیم اللہ کے دروازے پر پہنچا ۔ مارے خوف کے زمین پر ناک گھسنی کرنے لگا کہ ای کلیم اللہ میری فریاد ہی ۔ آپ نے فرمایا کہ جا ، اب اپنے کو بھی بیچ کر نقصان سے بچ جا ، تو تو اس کام میں بڑا مشّاق اُستاد ہو گیا ہی ۔ ابکے بھی اپنا نقصان دوسرے مسلمانوں کے متھے مار اور اپنی تھیلیوں اور ہمیانیوں کو دہرا تہرا بھر لے ۔ یہ امر شدنی جو تجھے آئینے میں اب نظر آ رہا ہی میں اس کو پہلے ہی اینٹ میں دیکھ چکا تھا ۔ آنے والی مصیبت کو عاقل پہلے سے دیکھ لیتا ہی اور نادان بالکل آخر میں دیکھتا ہی ۔

اُس نے دوبارہ رونا دھونا شروع کیا اور کہا کہ ای صاحب کرم مجھے مایوس نہ فرمائیے ۔ بلکہ رحمت و کرم کا امیدوار بنائیے ۔ مجھ سے تو نامناسب حرکت ہوئی لیکن آپ معاف فرمائیے ۔ حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے فرمایا کہ ای فرزند ! اب تو چلّے سے تیر نکل چکا اور تیر کے واپس آنے کا دستور نہیں ۔ البتہ میں اُس کی عدالت گاہ سے درخواست کرتا ہوں کہ مرتے وقت با ایمان مرے ۔ جو ایمان لے مرے وہ زندہ رہتا ہی اور جو ایمان ساتھ لے جائے وہ ہمیشہ زندہ رہتا ہی ۔

اُسی وقت اس کی طبیعت بگڑ گئی ، دل الٹ پلٹ ہونے لگا ، ایک طشت میں قے کی ۔ وہ قے موت کی تھی ہیضے کی نہ تھی ۔ چار آدمی اُٹھا کر گھر لے گئے ایسے حال میں کہ اس پر تشنج طاری تھا ۔ حضرت موسیٰؑ نے اس صبح کو مناجات میں عرض کی کہ ای خدا ! اسے ایمان سے بے نصیب نہ فرما تو اپنی بادشاہی کے صدقے میں اس پر بخشش فرما

یہ گستاخی و زیادتی اس نے بھولے سے کی تھی۔ ہر چند میں نے اس سے کہا تھا کہ علم تیرے لائق نہیں ہے لیکن وہ میری نصیحت کو ٹالنے کی بات سمجھا۔ خدائے بزرگ نے اس شخص پر رحم کیا اور موسیٰؑ کی دعا کو قبول فرمایا +



حضرت حمزہؓ کا میدان جنگ میں زرہ پہنے بغیر آنا

ایامِ جوانی میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ ہمیشہ جنگوں میں زرہ پہن کر شریک ہوتے تھے لیکن آخر عمر میں آپ کا یہ حال ہوا کہ جب آپ میدانِ جنگ میں آتے تو بے زرہ صفوں پر حملہ کرتے تھے۔ آپ کا سینہ کھُلا ہوا، تن برہنہ، سب سپاہیوں کے آگے آگے دشمن پر پہلی تلوار آپ ہی کی پڑتی تھی۔ لوگوں نے پوچھا کہ ای رسولؐ کے چچا! ای صفوں کو چیرنے والے شیر! ای جواں مردوں کے بادشاہ! کیا آپ نے خدا کا حکم نہیں سنا کہ اپنے آپ ہلاکت میں نہ پڑو۔ پس آپ جان بوجھ کر جنگ کے میدان میں موت کو کیوں دعوت دیتے ہیں۔ جس زمانے میں آپ جوان تھے مضبوط و قوی تو اس زمانے میں کبھی جنگ میں بے زرہ نہ جاتے تھے۔ اب جب کہ آپ بوڑھے اور کم زور ہو گئے ہیں تو بے پروائی کرتے ہیں۔ بھلا تلوار کس کی رعایت کرتی ہے اور سنان و تیر کو ایسی تمیز کہاں ہے۔ یہ تو بہت نامناسب ہے کہ آپ جیسا شیر دشمن کے ہاتھوں مارا جائے۔

بے خبر ہوا خواہوں نے اس قسم کی بہت سی نصیحتیں کیں اور عبرت دلائی۔ حضرت حمزہؓ نے جواب میں فرمایا کہ جب جوان تھا تو دیکھتا تھا کہ موت سے یہ جہان ہمیشہ کے لیے چھُٹ جاتا ہے لیکن نورِ محمدی کے تصدق میں اب میں اس شہرِ فانی کا گرفتار نہیں ہوں۔ اس جاہلیت کی جوانی میں مجھے زندگی عزیز تھی اور اب اسلام کے بڑھاپے میں موت

زیادہ پیاری ہے ۔

امیرِ بخارا کے غلام کا فرار ہونا اور واپس آنا

ایک عجیب قصّہ سنو کہ صدر جہاں امیرِ بخارا کا ایک پروردہ غلام جس قدر اپنے آقا کو عزیز تھا اسی قدر خود اپنے آقا کا والہ وشیدا تھا ۔ آقا نے بھی ترقی دے کر اسے کوتوال کے معزز عہدے پر سرفراز کر دیا تھا ۔ اتفاق سے کسی سنگین الزام کی تہمت لگی تو سزا اور بے آبروئی کے خوف سے فرار ہو گیا ۔ دس برس تک اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا رہا ۔ کبھی خراسان چل دیا کبھی قہستان جا نکلا اور کبھی جنگل جنگل بھٹکتا پھرا ۔ دس سال کی جُدائی کے بعد تاب نہ رہی اور صدر جہان کا شوق از حد بڑھ گیا ۔ اس کے دل نے کہا کہ اب تو جُدائی کی قوت نہیں بس اب وہیں چلوں اگر نافرمانی کی بھی تو اس سے توبہ کرکے پھر فرماں برداری اختیار کر دوں ۔ دفعتًہ سامنے ہو جاؤں اور اس کے قدموں پر گر پڑوں اور عرض کروں کہ یہ جان حاضر ہے ۔ چاہے زندہ رکھیے چاہے گوسفند قربانی کی طرح ذبح کر دیجیے ۔ دوسری جگہ زندگی کا بادشاہ بننے سے آپ کے قدموں میں مرنا بہتر ہے خواہ موت اختیاری سے ہو خواہ اضطراری سے لیکن بغیر آپ کے میری زندگی اجیرن ہو جاتی ہے ۔

لوگوں نے اس کو سمجھایا کہ تیرا اب بخارا جانا خطرے سے خالی نہیں مگر اس سے رہا نہ گیا اور گرتا پڑتا بخارا آ پہنچا ۔ وہاں جس کسی نے اسے دیکھا اور پہچانا اس سے یہی کہا کہ بادشاہ تجھ سے سخت ناراض ہے اور دیکھتے ہی تجھے جان سے مروا ڈالے گا ۔ یہ کیا حماقت کی کہ موت کے پھندے سے نکل کر پھر اسی جال میں پھنسنے کے لیے آیا ہے ۔

اس نے کہا کہ میں مرضِ استسقا میں مبتلا ہوں مجھے پانی خود کھینچ رہا ہے، ہر چند میں جانتا ہوں کہ پانی ہی مجھے مار ڈالے گا۔ چاہے پانی سے کتنی ہی تکلیف و صدمہ پہنچے استسقا کی بیماری والا پانی سے کبھی جدا نہیں ہوتا۔ چاہے میرے ہاتھ پیر سوج جائیں اور پیٹ پھول جائے مگر پانی کا عشق کبھی کم نہ ہوگا۔ اس سزا میں کہ میں اس سے دور بھاگا تھا میں نے خود اپنے کو اس کی پھانسی کے ڈنڈے پر لٹکا دیا ہے۔

غرض ہاتھ باندھے صدر جہاں کے حضور میں پہنچا۔ وہ عاشق آنکھوں سے آنسو بہاتا جاتا تھا اور بالکل بے خود تھا۔ ایک ہاتھ میں کفن اور دوسرے میں تیغ ساتھ تھی۔ ساری مخلوق سر اونچا کیے دیکھ رہی تھی کہ دیکھیے بادشاہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے، آگ میں ڈلواتا ہے یا پھانسی پر لٹکواتا ہے۔

جونہی کہ اس کی نظر صدر جہاں پر پڑی گویا اس کی جان تن سے نکل گئی۔ تنِ لاغر خشک لکڑی کی طرح زمین پر گر پڑا چوٹی سے پیر کے ناخن تک بالکل سرد تھا۔ لوگوں نے بخور و گلاب سے بہتیرے جتن کیے لیکن اس نے نہ حرکت کی نہ کسی بات کا جواب دیا۔

جب بادشاہ نے اس کا زرد چہرہ دیکھا تو گھوڑے سے اُتر کر اس کے پاس آیا اور کہا کہ دوست کو ایسا ہی چست و چالاک عاشق چاہیے کہ جب معشوق جلوہ دکھائے تو عاشق زندہ نہ بچے۔ بے شک تو عاشقِ حق ہے اور حق وہی ہے کہ جہاں حق پیدا ہو وہاں تیری خودی باقی نہ رہے۔

صدر جہاں کے دل میں اس کا یہ حال دیکھ کر محبت کی لہریں اُٹھنے لگیں اس کو زمین سے اُٹھا کر اپنی گود میں سر لے لیا اور چہرے پر آنسوؤں کی جھڑی برسانے لگا۔ بادشاہ نے اس کے کان میں آواز دی کہ اے دریوزہ گر! دامن پھیلا، یہاں زر و جواہر نثار ہو رہا ہے۔ تیری جان تو میرے فراق میں تڑپ رہی تھی، جب میں فراق کو دور کرنے آیا تو پھر تو کہاں غائب ہو گیا۔ اب ہوش میں آجا اور بے خودی کو دور کر۔ جب مژدۂ وصل

سُنائی دینے لگا تو مردے میں ہلکی ہلکی سی حرکت ہونے لگی۔ تھوڑی دیر میں خوشی اُٹھ بیٹھا، تڑپ کر ایک دو بار صدقے ہوا اور سجدے میں گر پڑا۔ اس کا چہرہ پھول کی طرح کھل کر تازہ ہوگیا اور کیفیت وصال کی لذت میں ہجر کی قید سے آزاد ہوگیا اور عرض کرنے لگا کہ ای عنقائے حق، ای میری جان تمھارے بلاگردان، خدا کا شکر ہی کہ آپ عظمت کی بلندی سے میرے پاس اتر آئے۔ پھر اپنی خطا اور بدنصیبی کا اقرار اور آقا کی جدائی کے صدمے بیان کرکے وہ کم زور اس قدر زار و قطار رویا کہ شریف و وضیع سب رونے لگے۔ اس کے دل سے ایسی ہاو ہو بے اختیار نکلی کہ عورت مرد میدانِ قیامت کی طرح اس کے گرد ایک جگہ جمع ہوگئے اور اُن پر بھی وہی حیرت اور گزشتہ کی یاد پر نالہ و زاری کی کیفیت طاری ہوگئی جو بازگشتہ کی کیفیت تھی۔

ای عزیز عشق دونوں عالم سے بیگانگی کا نام ہی۔ اس میں بہتر دیوانگیاں شامل ہیں اور اس کا مذہب بہتر فرقوں سے جُدا ہی اور بادشاہوں کا تخت اس کے نزدیک اسیری ہی عشق کا گویا وجد و حال میں یہ گیت گاتا ہی۔ ع بندگی قید اور خدائی دردِ سر۔ پس عشق کیا ہی، عدم کا دریا ہی جس میں عقل کے ہاتھ پیر ٹوٹ جاتے ہیں۔ لو اب تو بندگی اور بادشاہی کی حقیقت معلوم ہوئی۔ بس انہی دو پردوں میں عاشقی پوشیدہ ہی +



ایک لڑکے کا نقارے کے اونٹ کو ڈھول سے ڈرانا

کسی گانوں میں کھیت کی حفاظت ایک لڑکا کیا کرتا تھا اور ایک چھوٹا سا ڈھول بجا بجا کر پرندوں کو اُڑاتا رہتا تھا۔ اتفاق سے سلطان محمود کا گزر اس طرف ہوا تو اسی کھیت کے قریب لشکر کا پڑاو ڈالا گیا۔ اس فوج میں ایک بلند و بالا اونٹ (بختی) تھا جس پر فوجی نقارہ لادا جاتا تھا اور وہ مرغے کی طرح فوج کے آگے آگے چلتا تھا۔ فوج کی ہر نقل و حرکت پر دن رات نوبت

و نقارہ اسی اونٹ کی پیٹھ پر بجاتے تھے۔ ایک دن وہ اونٹ اس کھیت میں جا پڑا اور لڑکا گیہوں کی حفاظت کی خاطر ڈھول بجانے لگا۔ تب ایک شخص نے سمجھایا کہ ارے نادان وہ فوجی نقارے کا اونٹ ہی اس کو ایسی آوازوں کی عادت ہی۔ ای لڑکے! بھلا تیرے ڈھول کو وہ کیا سمجھتا ہی۔ اس پر تو اس سے بیس گُنا نقارۂ شاہی بجا کرتا ہی +



مچھّر کی فریاد حضرت سلیمانؑ کے پاس

گھانس اور چمن کے پتّوں سے مچھر نے آکر حضرت سلیمانؑ سے فریاد کی کہ ای سلیمانؑ! انسان و حیوان، جن و پری کا انصاف کرتے ہیں، ہوائی پرندے اور دریائی مچھلیاں سب آپ کی عدالت کی پناہ میں ہیں، وہ کون بدنصیب ہی جس نے آپ کی سرپرستی کا سہارا نہیں ڈھونڈا۔ ہماری داد کو پہنچیے کہ ہم بہت تکلیف میں ہیں اور انصاف سے محروم ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السّلام نے پوچھا کہ ای انصاف طلب کرنے والے بتا تو کس کے مقابلے میں انصاف چاہتا ہی۔ وہ کون ظالم ہی جس نے اپنی مونچھوں کے غرور پر تجھے ستایا اور تیرا مُنہ نوچا۔ ہمارے زمانۂ حکومت میں وہ کون شخص ہی جو ظلم کرنے میں بے باک ہو۔ مچھر نے عرض کی ہم ہوا کے ہاتھوں بڑی مصیبت میں ہیں اور اس کے ظلم سے اس قدر تنگ آگئے ہیں کہ اب سوائے فریاد کے کوئی علاج نہیں۔ ای بخشش و بخشایش کرنے والے عادل! آپ ہماری داد کو پہنچیے اور اس سے ہمارا بدلا لیجیے۔ پس حضرت سلیمانؑ نے کہا کہ ای سُریلی راگنی گانے والے خدا نے مجھے حکم دیا ہی کہ مدعا علیہ کا جواب لیے بغیر مدعی کی فریاد کو تسلیم نہ کر۔ اکیلا مدعی ہزار واویلا مچائے خبردار بغیر مدعا علیہ کا جواب سُنے ہوئے کسی کا دعویٰ قبول نہ کر۔ میری مجال نہیں کہ حکمِ الٰہی سے سرتابی کروں۔ لہٰذا جا اور اپنے مخالف فریق کو میرے پاس بُلا لا۔

مچھر نے عرض کی کہ حضور کا حکم سند ہی لہٰذا عرض ہی کہ میری دشمن ہوا ہی اور وہ آپ کی تابعِ فرمان ہی۔

یہ سُن کر حضرت نے فوراً پکارا کہ ای ہوا مچھر نے تجھ پر دعویٰ کیا ہی، تاریکی سے باہر نکل۔ چل، اپنے مدعی کے مقابل آ اور اپنی صفائی پیش کر۔

ہوا حکمِ شاہی سُن کر سنسناتی ہوئی جونہی پہنچی مچھر اُسی دم بھاگ نکلا۔ حضرت سلیمانؑ نے للکارا ارے مچھر کہاں جاتا ہی، ٹھیر تاکہ دونوں فریق کی بات سُن کر فیصلہ کروں۔ مچھر نے کہا کہ ای بادشاہ اس کی ہوت میں میری موت ہی، میری زندگی کے دن اسی کے دھوئیں سے کالے ہیں۔ جہاں وہ آجائے وہاں میرے پاؤں کیوں کر ٹک سکتے ہیں کہ ہوا سے میری جان کا انس نکل جاتا ہی۔

ای عزیز یہی حال بارگاہِ الٰہی کے ڈھونڈنے والے کا ہی، جہاں خدا نے جلوہ فرمایا کہ ڈھونڈنے والا گم ہوا۔ اگرچہ وہ وصال مسلسل بقا ہی لیکن اس بقا کا آغاز اپنی فنا سے ہوتا ہی +

ختم دفترِ سوم مثنوی

و

حصۂ اوّل حکایات رومی



(کتبہٗ بندۂ عاصی تجری عجلت رقم غفرلہٗ)

Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu Series No. 121.

HIKĀYĀT-I-RŪMĪ

Translated from Rūmī's Mat͟hnavī

by

MIRZA NIZĀM SHAH LABĪB

Revised by

MAULVI SYED HASHIMI (Farīdābādī)

Published by

The Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India).

DELHI

1939